فلسفہ کیا ہے

تالیف

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم اے۔ پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
رفیقِ اعزازی ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین دہلی

سلسلہ ندوۃ المصنفین
(۴۹)

فلسفہ کیا ہے؟

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا
صدر شعبہ فلسفہ جامعۂ عثمانیہ
حیدرآباد دکن
رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین دہلی

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ
قیمت مجلد دو روپیے

صفر المظفر ۱۳۷۱ھ طبع اوّل نومبر ۱۹۵۱ء

مطبوعہ
اشوکا پریس دہلی

مصنف کی دوسری کتابیں

۱۔ قرآن اور تصوف
۲۔ قرآن اور سیرت سازی
۳۔ رموز اقبال
۴۔ مراقبات
۵۔ توحید الوہیت (زیر طبع)
۶۔ قنوطیت یا فلسفہ یاس
۷۔ ابطال مادیت
۸۔ رسالۂ اخلاقیات

تراجم

۹۔ رہنمائے قرآن
۱۰۔ تاریخ فلاسفہ اسلام
۱۱۔ تاریخ مسائل فلسفہ
۱۲۔ مقدمہ فلسفہ حاضرہ
۱۳۔ فلسفہ کی پہلی کتاب
۱۴۔ مقدمہ مابعد الطبیعات

فہرست مضامین

قرآن اور فلسفہ[1]

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود!
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں! (غالب)

سقراط نے جب فلسفی کو "مشاہدہ حق کا شیدائی" قرار دیا تھا تو در اصل اس کے ذہن میں "عالم مابعد الطبیعیات" کا تصور نہ تھا، بلکہ ان الفاظ سے اس کا مقصود "نبی" کا وصف بیان کرنا تھا! کیونکہ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ فلسفہ کو اپنے اصطلاحی معنی کے لحاظ سے محض "حکمت کی محبت" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اصطلاحی معنی کی رو سے فلسفہ "مدلل علم" ہے نہ کہ "خالص بصیرت" اور مدلل علم ہی کے معنی میں افلاطون اور ارسطو نے فلسفہ کو استعمال کیا ہے اور یہی مفہوم عام طور پر فلسفہ کا لیا بھی جانے لگا ہے۔

لیکن فلسفہ کو 'مدلل علم' کہنے سے اس کا سارا مفہوم ادا نہیں ہو جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وصف کی وجہ سے ہم اس کا امتیاز "عام تجربہ" سے کرنے لگتے ہیں کیونکہ عام تجربہ کسی شئے کو محض رد یا قبول کر لیتا ہے۔ اس پر غور و فکر نہیں کرتا۔ یہی وصف فلسفہ کو آرٹ یا فن سے بھی ممیز کرتا ہے کیونکہ فن کا کام ایجاد یا تخلیق ہے، غور و فکر نہیں! اسی وصف کی وجہ سے ہم 'فلسفہ' اور 'علم فطرت' میں تشابہ پاتے ہیں۔ کیونکہ ثانی الذکر کا کام بھی فکر و استدلال ہے، وہ بھی مدلل علم قرار دیا جا سکتا ہے۔ تو پھر فلسفہ کو 'علوم فطریہ' سے کس طرح ممیز کیا جائے؟

فلسفہ اور سائنس (علوم فطریہ) میں فرق و امتیاز کی دو بنیادی وجوہ ہیں:

[1] یہ مقالہ پہلی مرتبہ معارف دسمبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

(۱) فلسفہ کا موضوع حقیقت کی ناقابلِ تحویل ماہیت ہوتا ہے۔

(۲) فلسفہ کا موضوع صرف ایک واقعہ یا واقعات کے ایک مجموعہ کی انتہائی حقیقت نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ کہ موجود ہے، کل وجود کی انتہائی اور ناقابلِ تحویل ماہیت یا حقیقت کا جاننا فلسفہ کا کام ہے۔ یہ وہ انتہائی حقیقت ہے جس میں پروفیسر ہالڈین کے الفاظ میں "باقی تمام چیزیں تو تحویل ہو سکتی ہیں لیکن وہ خود اپنے سوا کسی چیز میں تحویل نہیں ہو سکتی، اور اس کے حدود میں باقی تمام چیزیں تو ادا کی جا سکتی ہیں لیکن وہ خود اپنے سوا کسی اور شئے کے حدود میں ادا نہیں ہو سکتی"

یہی وہ خصوصیت ممیزہ ہے جو فلسفہ کو سائنس سے جدا کرتی ہے۔ فلسفہ کل حقیقت سے بحث کرتا ہے، اس کے برخلاف سائنس مظاہر کے ایک محدود مجموعہ کا مطالعہ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں فلسفہ حقیقت کی ناقابلِ تحویل یا انتہائی ماہیت کو معلوم کرنا چاہتا ہے، اس کے برخلاف سائنس یہ سوال ہی نہیں اٹھاتی کہ ان مظاہر کی تحویل کسی اور قسم کے مظاہر میں ہو سکتی ہے یا نہیں۔

مثالوں سے ہمارے اس اجمالی دعوے کی توضیح ہو سکتی ہے۔ عالمِ فعلیات زندہ خلیہ کی تحقیق کر رہا ہے۔ اس کا کام یہ دریافت کرنا نہیں کہ آیا اس کی حقیقت مادی ہے یا روحانی، یا بالفاظ دیگر وہ یہ جاننا نہیں چاہتا کہ نخزمایہ کی تحویل مادی توانائی میں ہو سکتی ہے یا شعور میں۔ وہ ان سوالات کو فلسفی کے لیے چھوڑ دیتا ہے کہ ان روحانی اور طبعی اعمال کی حقیقی ماہیت کیا ہے؟ کیا حقیقت کی تقسیم بالآخر روحانی و مادی حقائق میں کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ تقسیم انتہائی اور قطعی ہے؟ یا پھر روحانی حقیقت کی مادی حقیقت میں تحویل کر دی جا سکتی ہے؟ کیا فکر دماغ کی فعلیت کا ایک وظیفہ ہے؟ کیا خود مادی حقیقت کی تحویل روحانی حقیقت میں ہو سکتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر مادہ روح ہی کی ایک تجلی یا ظہور ہے؟ وہ ان عمیق سوالات کو فلسفی کے لیے چھوڑ کر خود واقعات کی تحلیل کرنے لگتا ہے، ایک

واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مربوط کرتا ہے، مثلاً بڑھتی ہوئی تپش کو بڑھتی ہوئی رگڑ سے شرارے کو برقی حلقہ سے۔ اس کے برخلاف فلسفی ہر واقعہ یا واقعات کے ہر مجموعہ (یا حقیقت کے محدود جزء) کو کل حقیقت سے مربوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر محض یہ سوال نہیں ہوتا کہ ایک واقعہ کی توجیہ دوسرے واقعہ سے کیسے ہو سکتی ہے بلکہ وہ جاننا یہ چاہتا ہے کہ ہر واقعہ کا کلّی نظام سے کیا تعلق ہے؟ اسی سوال کی تحقیق کی کوشش میں بعض دفعہ اس کو حقیقت کی یافت ہو جاتی ہے تو چیخ اٹھتا ہے:

حق فاعل و ہر چہ جز حق آلات بود — تاثیر ز آلت از محالات بود

ہستی کہ موثر حقیقی ست یکیست — باقی ہمہ اوہام و خیالات بود (جامی)

بیان بالا سے یہ صاف ظاہر ہے کہ فلسفہ کا موضوع بحث انتہائی و ناقابلِ تحویل حقیقت ہے اور وہ کل حقیقت ہے، 'وجود من حیث کل' ہے۔ اس کو ہم انتہائی و آخر اس لیے قرار دے رہے ہیں کہ وہ ناقابلِ تحویل ہے یعنی اس کی تحویل کسی اور آخری یا انتہائی حقیقت میں نہیں کی جا سکتی، کیونکہ وہ کسی اور آخری یا انتہائی حقیقت کا ظہور یا تجلی یا تعین نہیں اور اس لیے بھی کہ اس کے ماوراء کوئی حقیقت نہیں، کیونکہ وہ ہمہ محیط ہے، کل ہے، جو کچھ بھی موجود ہے اسی میں شامل و داخل ہے۔

؎ ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست!

جب فلسفہ کا معروض 'کلِ مطلق' قرار پاتا ہے، جو قطعاً آخر و ناقابلِ تحویل حقیقت ہے تو فلسفہ تکمیلِ مراد کا نام نہیں ہو سکتا بلکہ تلاش و جستجو، سعی و کوشش، طلب و اجتہاد کا نام ہے۔ اسی حقیقت کی یافت کے بعد شیخ سینا کی زبان سے نکلا تھا:

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت — یک موئے نہ دانست ولی موئے شگافت

اندر دل من ہزار خورشید بتافت — و آخر بکمال ذرّہ راہ نیافت

جرمنی کے مشہور فلسفی اسٹمپفٹ (Stumpft) نے اسی لیے فلسفہ کو "استفہامی علم"

(Question-Science) قرار دیا ہے اور ولیم جیمس نے مابعد الطبیعیات کی تعریف ہی اس طرح کی ہے کہ وہ سوالات کرنے کی ایک غیر معمولی اور پیہم کوشش کا نام ہے، اور پاولسن کہتا ہے کہ فلسفہ کوئی "سربستہ نظریہ" نہیں بلکہ ایک "حل طلب مسئلہ" ہے!

فلسفہ کی ان خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:۔

"فلسفہ عقل و استدلال کے ذریعہ کسی شئے کی آخری و انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور فلسفہ اپنی موزوں ترین شکل میں تمام موجودات کی انتہائی ماہیت کو دریافت کرنے کی سعی کا نام ہے"[1]

یہ ہے یورپ کے مایۂ ناز فلسفیوں کی تحقیق جو فلسفہ کی تعریف و ماہیت کے متعلق زمانۂ حال میں کی گئی ہے!

اس تحقیق کی رو سے سائنس کا سارا تعلق عالم مظاہر سے ہے جس کو قرآن کی زبان میں "عالم شہادت" کہا جا سکتا ہے اور فلسفہ عالم شہادت کی انتہائی حقیقت یا ماہیت کو معلوم کرنا چاہتا ہے جو غیب کا دائرہ ہے اور جس کو قرآن کی زبان میں "عالمِ غیب" قرار دیا جا سکتا ہے۔

سائنس کا کام عالم شہادت کے واقعات کا بیان کرنا ہے۔ جے آر تھامسن نے دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ "یہ واقعات تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"۔ عالمِ سائنس مظاہرِ عالم کے ایک مجموعہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جن کی اس کو تحقیق کرنی ہے جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل و ترکیب کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے پھر ان شرائط یا علل کا مطالعہ کرتا ہے جن کے

[1] دیکھو M.W. Calkins کی کتاب Persistent Problems of Philosophy باب اول صفحہ ۳ تا ۶۔

تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں، ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے، یعنی ان کے قوانین عمل کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کر دیتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالمِ سائنس کے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اس نے واقعات تجربیہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرزِ وقوع و طریقِ عمل کو سمجھا دیا۔ غرض عالمِ سائنس کا کام اس عالمِ شہادت سے ہے، اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر کی جانب لگی رہتی ہے، اس کی توجہ تجربات کی طرف ہوتی ہے، اشیاء کے باہمی ربط کو وہ دریافت کرتا ہے، ان کے بیان کرنے میں وہ حزم و احتیاط سے کام لیتا ہے اور اس طرح وہ ان قوانین و علل کو معلوم کر لیتا ہے جن کے تحت عالم شہادت کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اس علم سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے، کائنات کی تسخیر میں وہ کامیاب ہوتا ہے اور "سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے بیان کی عملی تصدیق کرتا ہے۔

عالمِ سائنس کے برخلاف فلسفی کو عالمِ غیب کی تلاش ہوتی ہے، وہ مظاہر عالم کے ماوراء پہنچ کر "حقائق اشیاء" کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حقائق کے انتہائی علوم پر مطلع ہونا چاہتا ہے، اس حقیقت الحقائق کی ماہیت سے واقف ہونا چاہتا ہے جو انتہائی اور آخری حقیقت ہے، جو اشیاء کا "باطن" ہے، جو باوجود اشیاء میں شدتِ ظہور کے غیب الغیب ہے، جس کا علم انسان کے حواس و قیاس و ادراک و فہم و عقل کے لیے مستور ہے۔

اس غیب کے علم کی طلب انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس کی جستجو و طلب ہی نے اس کو حیوان سے ممتاز کیا ہے! اس کے تمام علوم و فنون، حکمت و فلسفہ اسی غیب کے یقین اور اس کی پیہم جستجو کا نتیجہ ہیں! اسی غیب کی یافت کی تڑپ میں وہ تن کی پرورش کو بھی ایک حقیر و ذلیل عمل قرار دیتا رہا ہے اور اپنے نفس کو مخاطب

کر کے کہتا رہا ہے:

یک دم غمِ جاں بخور غمِ ناں تا کے ‏ در پرورشِ ایں تنِ ناداں تا کے
اندر رہِ طبلِ شکم و نائے گلو ‏ ایں رقصِ زنخ بضربِ دنداں تا کے (رومی)

لیکن جن غیبوں تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے وہ صحیح معنی میں غیب نہیں بلکہ ہمارے عالمِ شہادت ہی کے ذرا مخفی اور دور افتادہ گوشے ہیں جن کو محض اضافی و اعتباری غیوب کہا جا سکتا ہے! غالب نے اس حقیقت کو کیا خوب ادا کیا ہے!

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ‏ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

باقی اصلی اور حقیقی غیب یا "غیب الغیب" تک انسانی عقل اور ذرائع علم کی رسائی کبھی بھی نہیں ہو سکتی! "قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ"[1] (پ ۲ع ۱۶) سے قرآن اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے! اور "قُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ"[2] (پ ۱۱ ع ۱۰) پر زور دے کر انسان سے اس کے علم کی قطعی نفی کر رہا ہے!

تاریخ فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ میں ادعای نظامات کے پیش ہونے کے بعد ہی جب غیب کے کلی و یقینی علم کا فلسفیوں نے دعویٰ کیا ہے ارتیابیت، اور "لا ادریت" نے ان کے ان بلند بانگ دعووں کی شدت سے تردید شروع کر دی اور انسانی علم کو عالمِ شہادت ہی تک محدود کر دیا! ہیوم نے فلسفہ جدید میں نہایت قوت کے ساتھ یہ واضح کر دیا ہے کہ انسان کا سارا علم مظاہر ہی کی حد تک محدود ہے، کیونکہ اس کا دار و مدار "ارتسامات" یا ان کی نقل "تصورات" پر ہے، لہٰذا 'محسوس' ہی کو ہم 'موجود' کہہ سکتے ہیں اور 'غائب' کا ہمیں کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ ہیوم کی ارتیابیت نے کانٹ کو اس کے خواب ادعائیت سے جگایا اور جاگنے کے بعد اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حقائق اشیاء کا علم نہ صرف یہ کہ اب تک انسان کو حاصل

---

[1] کہہ دو (اے محمدؐ) کہ زمین اور آسمان میں سوائے اللہ کے کوئی غیب کو نہیں جانتا [2] غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

نہیں ہوا بلکہ عقل و استدلال کی راہ سے ہمیشہ کے لیے ناممکن الحصول ہے "حقائقِ اشیاء" کو کانٹ کی اصطلاح میں "بواطن" (یا *Noumena*) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور انسانی علم اس کے مقابلہ ظواہر یا "*Phenomena*" یا قرآن کی اصطلاح میں "عالمِ شہادت" تک محدود ہے۔

قدیم زمانہ میں اشراقیہ اور جدید زمانہ میں سریہ (*Mystics*) اور برگسان جیسے فلاسفہ نے غیب کے علم کے لیے حواس و عقل کو تو قطعاً ناقابلِ علم قرار دیا لیکن 'کشف' یا 'وجدان' یا 'سرّی ذرائع علم' کے نام سے جس علم کے دامن میں پناہ پکڑی وہ محض ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے جو ڈوبنے سے بہرحال نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ لا ادریہ اور ارتیابیہ نے جن دلائل سے انسانی عقل کو حقائق اشیا یا غیب کے علم کے ناقابل قرار دیا وہی دلائل کشف و وجدان کے خلاف استعمال کیے جا سکتے ہیں اور بتلایا جا سکتا ہے کہ عقل کی طرح کشف و وجدان بھی انسانی علم ہی کی کوئی قوت ہے اور عقل و استدلال کی طرح اضافی اور اعتباری ہے اور اس کو بھی ناقابلِ خطا اور یقینی اسی طرح نہیں قرار دیا جا سکتا جس طرح کہ انسانی عقل و استدلال کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دونوں بہرحال انسان کے محدود، ناقص، اضافی و اعتباری ذرائع علم ہیں۔

قرآن نے اس حقیقت کو مختلف طرح سے تعبیر کیا ہے۔ نہایت قطعیت اور وضاحت کے ساتھ یہ بتلا دیا گیا ہے کہ غیب کا علم انسان کو بذاتِ خود حاصل نہیں ہو سکتا صرف حق تعالیٰ ہی کے دینے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لو۔

یہ امر کہ علمِ غیب خاصہ حق تعالیٰ ہے اس کے سوا کسی کو نہیں۔ قرآنِ مبین میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایجابی طور پر اس حقیقت کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے: وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] (پ ۱۲ ع ۱۰) اور نفیاً اسی مفہوم کو اس

[1] اور آسمانوں اور زمین میں جتنے غیب کی باتیں ہیں ان کا علم خدا ہی کو ہے

طرح بیان کیا گیا ہے: قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ اور غیر اللہ سے علمِ غیب کی مطلق نفی اسی طرح کی گئی ہے: وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَؕ (پ ۳۶)

تاریخ فلسفہ جدید میں لاادریہ، ایجابیہ اور نتاجیہ نے انسانی علم کو مظاہر ہی کی حد تک محدود کر دیا اور مطلق اور غیب کے علم کی اس سے نفی کر دی، اور اس طرح انسان کو غیب کے علم سے ہر طرح محروم کر دیا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے غیب کے علم کی طلب و خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس کے قلب میں غیب کے حصول و یافت کی تڑپ پائی جاتی ہے اور اسی تڑپ اور طلب و جستجو نے اس کو حیوانوں سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کی تشفی کا انتظام ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ گو غیب کا علم انسان کو نہیں، اس کے حواس اور عقل اور تمام ذرائع علم اس کے حصول کے براہ راست قابل نہیں لیکن اگر اللہ چاہے تو کسی ذریعہ سے اپنے غیب کا علم انسان کو دے سکتا ہے اور اسی ذریعہ کا نام قرآن کی اصطلاح میں "رسول" ہوتا ہے۔ صاف الفاظ میں اس حقیقت کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے:۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (پ ۳۶)

جب انسان غیب کے علم کو بذاتِ خود حاصل نہیں کر سکتا اور یہ علم صرف حق تعالیٰ ہی رسولوں کے ذریعہ عطا کر سکتے ہیں تو اب حقائقِ عالم یا جن کو فلسفہ کی اصطلاح میں "نہائی حقیقت کا علم" یا "انتہائی علوم حقائق" کہا جاتا ہے ان پر مطلع ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ انسان اللہ اور رسولوں پر ایمان لائے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

لہ اور اللہ ہی کے پاس کنجیاں ہیں تمام مخفی اشیاء کی، نہیں جانتا ہے انہیں لیکن وہی۔

ٹہ غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں مگر کسی برگزیدہ پیغمبر کو۔

Pragmatists ے Positivists ے Agnostics ہے

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ[1] (پ ۴ ع ۹)

غرض اس طرح انسان کے لیے انتہائی حقائق یا غیوب کے جاننے کا ذریعہ صرف اللہ اور رسول پر ایمان ہے جس کے بغیر قرآن کی رو سے انسان روشنی سے قطعاً محروم رہتا ہے، اسی لیے فرمایا گیا ہے: مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ[2] (پ ۱۸ ع ۱۱)

غیب کے علم کو جاننے کے ذریعے سے محروم ہونے کے باوجود، تجربہ حواس کے ماوراء جانے اور حقیقت انتہائی کے حضور میں پہنچنے کی قابلیت سے قطعاً عاری ہونے کے باوجود جو لوگ اس کے متعلق لال بجھکڑوں کی سی اٹکل پچو غیر مقرر باتیں بناتے ہیں ان کو قرآن نے "خراصون" کے لقب سے یاد کیا ہے جس کے معنی "بے سند باتیں بنانے والوں" کے ہیں۔ ان کی باتوں کو "ظن وخرص" سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی بات سننے اور ماننے سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے گمراہی اور ضلالت کے کچھ نہیں: وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ[3] ۝ (پ ۸ ع ۱)

اور قرآن کا کام ہی یہ قرار دیا گیا ہے کہ انسان کو جہل کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں لاتا ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ[4] ۝ (پ ۱۳ ع ۶)

جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی بات کی طرف سے اپنا منہ پھیر کر انتہائی حقیقت کو اپنے علم، عقل، کشف یا وجدان سے جاننے کی کوشش کی وہ ابتدائے فکر انسانی سے اب

---

[1] اللہ تعالیٰ تم کو غیب کی خبر دینے والا نہیں ہے، البتہ جس کو چاہتا ہے اپنے رسولوں میں سے اس غیب کی اطلاع کے لیے انتخاب کرتا ہے، لہذا اگر تم غیب پر مطلع ہونا چاہتے ہو تو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔
[2] جس کو اللہ روشنی نہ عطا کرے اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔ [3] دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا مانیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں، وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔
[4] یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے کہ آپ تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی

تک بھی اپنی غیر معمولی اور پیہم کوششوں کے باوجود صرف سوالات کے اٹھانے میں مصروف ہیں جن کا اب تک بھی انہیں کوئی تشفی بخش جواب مل نہ سکا، ان کے نزدیک یہ علم محض ایک "استفہامی علم" بن کر رہ گیا ہے، کوئی "سربستہ نظریہ" نہیں بلکہ ایک "حل طلب مسئلہ" ہے!
عقلِ انسانی کی اس حرماں نصیبی کو پیشِ نظر رکھ کر رومیؔ نے فلسفی کے متعلق کہا تھا:

فلسفی گو یداز معقولاتِ دوں　　عقل از دہلیز می ناید بروں!
فلسفی منکر شود در فکر و ظن　　گو برو سر را بداں دیوار زن!

فلسفی انتہائی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے، عقل کے ذریعہ جاننا چاہتا ہے، فکر و اندیشہ کے ذریعہ جاننا چاہتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا منہ خزانہ کی طرف ہے اور وہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن حقیقت میں اس کا منہ خزانہ کی طرف نہیں بلکہ اس کی پیٹھ خزانے کی طرف ہے اور وہ جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے خزانے سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت　　گو بدو کورا سوئے گنج است پشت
گو بدو، چنداں کہ افزوں می دود　　از مرادِ دل جدا تر می شود! (رومیؔ)

فکر و استدلال سے جو کچھ فلسفی نے پایا ہے اس کو یہ دانائے راز مشک نہیں "پشک سرگین" قرار دیتا ہے، کیونکہ گو بظاہر بات مدلل اور قوی معلوم ہوتی ہے لیکن صداقت سے عاری ہوتی ہے:

مشک آلودہ است اما مشک نے　　بوئے مشکستش ولے جز پشک سرگین نے

انتہائی حقیقت کا علم اگر حاصل ہو سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ ہم "ظن و تخمین" "خوض و خرص" کو چھوڑ کر (ذرھم فی خوضھم یلعبون) قرآن کریم اور ارشاداتِ نبوی کی طرف توجہ کریں جو مبدء ہیں علم حقیقی کا اور جو شک و ریب، قیاس و وہم، ظن و تخمین سے منزہ ہیں۔
یہیں ہمیں وہ نورِ ہدایت حاصل ہو سکتا ہے جس کو عقل نظری ہمیں عطا نہیں کر سکتی:
اِنَّ ھُدَی اللہِ ھُوَالھُدٰی! یہیں ہمارے لیے یقین و اذعان کا ذخیرہ ہے، یہیں بداہت و ہدایت کا جلوہ ہے، یہیں علم حقایق ہے اور یہیں طمانیت و تسکین! اسی کی ہمیں تاکید کی گئی

ہے: وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ؁ شاہ ولی اللہؒ نے اسی مفہوم کو خوب ادا کیا ہے:

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است　　واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی ست

جائیکہ بود جلوۂ حق حاکمِ وقت　　تابع شدنِ حکم خرد بوالہبی ست

سطورِ بالا میں ہم نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ عالمِ سائنس نے اپنا موضوعِ تحقیق عالم مظاہر یا عالم شہادت کو بنایا، عقل و حواس کے ذریعہ اس نے فطرت کی یکسانیتِ عمل اور قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی، اس کی نگاہ واقعات و مظاہر ہی کی جانب لگی رہی، مشاہدے اور تجربے کے ذریعہ اس نے ان قوانین کو دریافت کر لیا اور تسخیر قوائے کائنات میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس کے برخلاف فلسفہ نے کوشش کی کہ مظاہر کے عالم کے ماوراء پہنچ کر "غیب" یا "حقائق اشیاء" کو معلوم کر لے اور چونکہ یہ کام عقلِ انسانی کی قدرت سے باہر ہے اس لیے فلسفہ محض ایک "استفہامی علم" بن کر رہ گیا جس کا کام صرف سوال کرنا ہی قرار پایا اور عقل کو تنقید سے کبھی فرصت نہ مل سکی لہٰذا ؏

رُست از یک بند تا افتاد در بندے دگر　(اقبال)

اُدھر قرآن نے صاف طور پر جتلا دیا کہ غیوب کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے اور وہ اپنے رسولوں کے ذریعہ انسان کو اتنا ہی علم عطا کرتے ہیں جتنا کہ وہ انسان کی دینی و دنیوی فلاح کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، اور قرآن کے بالاستیعاب مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ صرف اس غیبی علم کو رسولوں کے ذریعہ ہم پر منکشف کرتے ہیں جس کا جاننا ہماری عملی زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے، مفید اور نافع ہوتا ہے، اور وہ ما فوق الفہم اسرار جن کے سمجھنے کی حیاتِ انسانی کو حاجت نہیں اور اس کی عملی زندگی کی فلاح

؁ یہ میری سیدھی راہ ہے تم اس کا اتباع کرو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اللہ کی راہ سے جُدا کر دینگی، اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔

کے لیے ان کا علم ضروری نہیں، جن کا عمل سے کوئی تعلق نہیں، ان کو "لَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ"[1] کہہ کر چھوڑ جاتے ہیں اور ان پر محض ایمان لانے کی تاکید کرتے ہیں!

جب غیب کا علم انسان کی عقل کی دسترس سے باہر ہے اور جب غیب کے متعلق حق تعالیٰ نے انبیاء ہی کے ذریعہ انسان کو علم عطا کیا ہے اور وہی علم عطا کیا ہے جس کے تحت میں کوئی عمل ہوتا ہے تو پھر اہلِ حق کے یہ دو اصول منطقی طور پر لازم آتے ہیں اور جن کو قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔

"(۱) پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام عقائد و اعمال کے متعلق اپنی امت کو جو کچھ تعلیم و تلقین فرما گئے اس پر ایک ذرہ کا اضافہ یا اس سے ایک ذرہ کی کمی نہیں ہو سکتی۔

(۲) خدا کی ذات و صفات و دیگر عقائد کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے یا پیغمبر سے بتواتر جو کچھ ثابت ہے اور ان کی نسبت اجمالاً یا تفصیلاً جو کچھ اور جس حد تک انہوں نے تفسیر و تشریح کی ہے اسی پر ایمان لانا واجب ہے اور اپنی عقل و قیاس و استنباط سے تفسیر و تشریح کرنی صحیح نہیں اور نہ اس پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا جزء ہے"[2]۔

ان عقائد و اعمال کے متعلق جو تعلیم ہمیں دی گئی ہے ان میں اضافہ یا کمی کرنا یا ان کی عقل و قیاس سے توجیہ و تعبیر کرنا اس امر کا دعویٰ کرنا ہوگا کہ ہم براہ راست اپنی عقل یا وجدان کے ذریعہ ان غیبی علوم کو حاصل کر سکتے ہیں، ہمیں کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں، ہم سارے پیغمبروں کی آمد و بعثت سے مستغنی ہو سکتے ہیں!

اہلِ حق نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے ہمیشہ اپنی عقل کو پیغمبر اسلام کی عقل پر قربان کر دیا اور حسبی اللہ کہہ کر حق تعالیٰ کی بات پر ایمان لائے اور اپنی زبان روک لی اور کہا تو صرف یہ کہا کہ:-

---

[1] اس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ [2] دیکھو رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ مولفہ مولانا سلیمان ندوی مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڈھ ص ۲۷۔

عقل قرباں کن بہ پیشِ مصطفےٰ ۔۔۔ حسبی اللہ گو کہ اللہ ہم کفےٰ

زیں خرد جاہل ہمیں باید شدن ۔۔۔ دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد ۔۔۔ ایں عسس را دید و درخانہ نشد (رومی)

اسلام میں یہ اہل السنۃ والجماعۃ ہی کا طبقہ ہے جنہوں نے عقائد میں گفتگو کو ہمیشہ ناپسند کیا اور "اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" کہہ کر ایمان لائے اور جادۂ مستقیم پر قائم رہے۔ ان کے عقائد وہی رہے جو پیغمبرِ اسلام اور ان کے صحابۂ کبار کے تھے، اسی لیے انہیں اہل السنۃ والجماعۃ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ "علم اللہ" کے تابع ہیں۔ "ہویٰ" کے پیرو نہیں، یہ 'مستِ خدا' ہیں، بالغ ہیں اطفال نہیں!

خلق اطفال اند جز مستِ خدا ۔۔۔ نیست بالغ جز رہیدہ از ہویٰ (رومی)

امام مالک بن انس رضؓ اہل السنۃ کا عقیدہ ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں :-

الکلام فی الدین اکرہ ولا یزال	میں عقائد میں گفتگو کرنا ناپسند کرتا ہوں اور ہمیشہ ہمارے
اھل بلدنا یکرھونہ وینھون عنہ	شہر (مدینہ) کے علماء اس کو ناپسند کرتے رہے ہیں اور
نحو الکلام فی رای جھم والقدر و	اس سے روکتے رہے ہیں مثلاً جہم کی رائے اور قدر
ما اشبھہ ذٰلک وما احب الکلام	میں گفتگو کرنا یعنی بحث و مباحثہ ان امور میں ناپسند
الا فیما تحتہ عمل، فاما الکلام فی	کرتا ہوں جن کے تحت میں کوئی عمل نہ ہو لیکن خدا کے
دین اللہ وفی اللہ عز وجل فالسکوت	عقائد اور خود خدا کی ذات میں سکوت میرے نزدیک
احب الی لانی رایت اھل بلدنا	پسندیدہ ہے کیونکہ ہم نے اپنے شہر کے علماء کو دیکھا ہے
ینھون عن الکلام فی الدین	کہ عقائد میں گفتگو کرنے سے روکتے تھے سوائے ان امور
الا فیما تحتہ عمل [1]	کے جن کو عمل سے تعلق ہو۔

امام مالک کے ان الفاظ سے نہ صرف ان کے اصول کی صراحت ہوتی ہے بلکہ ان

[1] جامع بیان العلم ابن عبدالبر منقول از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ صفحہ

سے سلف کا طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ان امور میں گفتگو کرتے تھے جن پر عملاً بھی ہم کو کاربند ہونا ہے، عمل نہ کہ تخیل ان کا مطلوب و مقصود تھا!

"نہ عاقلی رہا کن کہ با دتواں رسیدن بدل نیاز مندے بہ نگاہِ پاکبازے" (اقبال)

امام ترمذی ائمہ سنّت کا اصول بتاتے ہیں:۔

والمذهب فى هذا عند اهل العلم من	ائمہ اہل علم جیسے سفیان ثوری، مالک بن انس
الائمة مثل سفيان الثورى و مالك بن	سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک وغیرہ کا اس
انس و سفيان بن عيينة و ابن المبارك	بارہ میں مذہب یہ تھا کہ انہوں نے ان چیزوں
و وكيع وغيرهم انهم رووا هذه الاشياء	کی روایت کی اور کہا ہم حدیثوں کی روایت کرتے
وقالوا نروى هذه الاحاديث و نومن بها	ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ نہیں کہا جائے
ولا يقال كيف وهذا الذى اختاره	کہ یہ کیوں کر رہے ہیں اور اسی مذہب کو اہل حدیث
اهل الحديث ان يروى هذه الاشياء	نے اختیار کیا ہے کہ ان باتوں کی روایت کر دی جس
كما جاءت و يومن بها ولا تفسر ولا يتوهم	طرح پر وہ آئی ہیں اور ان پر ایمان رکھا جائے اور
ولا يقال كيف وهذا امر اهل العلم	ان کی تفسیر نہ کی جائے اور نہ وہم کیا جائے اور نہ
الذى اختاره وذهبوا اليه[1]	"کیسے" کہا جائے۔ اہل علم کا یہی مذہب ہے اور اسی کو انہوں نے

عارف رومی نے اس مسلک کو یوں ادا کیا ہے اور اس کی دلیل بھی پیش کی ہے۔

عقل را قربان کن اندر عشق دوست
عقل را باری ازاں سوییت کوست

اے برده عقل ہدیہ تا الٰہ
عقل آنجا کمترست از خاکِ راہ

عقل چوں سایہ بود حق آفتاب
سایہ را با آفتاب او چہ تاب

عقل چوں شحنہ است چو سلطاں رسید
شحنہ بیچارہ در کنجے خزید (رومی)

اس بیان سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اہلِ سنۃ کا رویہ "خلاف عقل" ہے اور اس لیے

[1] جامع بیان العلم ابن عبد البر منقول از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ صـ۱۲

وہ مذہب میں عقل کی مطلق دخل اندازی جائز نہیں رکھتے۔ بات صرف اتنی ہے اور اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے، کہ جب عقل ماورائے حواس جا نہیں سکتی اور حقائق اشیاء کا علم حاصل نہیں کر سکتی، جو غیب کا دائرہ ہے اور عقل کی دسترس سے باہر، تو پھر عقلی طور پر یہی لازم آتا ہے کہ عقل کو بیکار محض نہیں بلکہ محدود قرار دیا جائے، اس کی تحقیر نہ کی جائے بلکہ اس کی قابلیت اور قدرت کی تحدید کر دی جائے اور اس کا اصلی دائرہ عالم مظاہر یا شہادت قرار دیا جائے نہ کہ عالمِ غیب۔ جس طرح بصارت ایک خاص فاصلہ کے آگے نہیں دیکھ سکتی اور سماعت اپنے عمل کے لیے ایک مخصوص دائرہ چاہتی ہے جس کے بعد وہ بیکار رہتی ہے اسی طرح عقلِ انسانی کا بھی ایک محدود دائرہ ہوتا ہے جس میں وہ عمل کرتی ہے اور اس سے باہر وہ قطعاً بیکار ثابت ہوتی ہے۔ یہ دائرہ واقعات تجربیہ کا دائرہ ہے، اس سے ماوراء عقل جا نہیں سکتی۔ قرآن نے جن غیبی حقائق کو پیش کیا ہے وہ قطعاً "خلافِ عقل" (Contra-rational) نہیں، وہ "ماوراء طورِ عقل" ہیں (Supra-rational)۔ جس دائرہ میں عقل قدم زن نہ ہو سکتی ہو جس دائرہ کا علم حق تعالیٰ انبیاء کے ذریعہ ہی عطا کرتے ہوں اس دائرہ میں ہم کو اپنی عقل کی روشنی سے نہیں بلکہ خدا کی دی ہوئی روشنی کے سہارے ہی سے چلنا چاہیے۔ اپنی عقل کو علمِ الٰہی کے تابع کرنے کے معنی بے عقل یا پاگل ہونے کے نہیں، خلافِ عقل راہ چلنے کے نہیں بلکہ بقول عارف رومی ہمہ تن "سر و عقل" ہونے کے ہیں:-

"زیں سر از حیرت گر ایں عقلت رود   ہر سر مویت سر و عقلے بود"

کیونکہ ہماری عقل "جزئی" ہے اور حق تعالیٰ کی عقل "کلی"، ہماری عقل جزئی ہونے کی وجہ سے "کل" کا علم حاصل نہیں کر سکتی، اپنی تقیید و تحدید کی وجہ سے وہ کلی حقیقت کی گرفت سے قاصر ہوتی ہے، اس کا علم جزئی، اضافی یا اعتباری ہوتا ہے اور حق تعالیٰ ہی کا علم مطلق ہوتا ہے۔ ہم اپنی عقل کو عقلِ کلی کے تابع کر دینے سے اس علم کے

بھی سرمایہ دار ہو جاتے ہیں جس کو ہماری عقل بذاتِ خود حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ عقلِ جزئی تابع وحیِ الٰہی ہو کر عقل "خود بیں" نہیں رہتی عقل "جہاں بیں" ہو جاتی ہے، اِن دونوں عقلوں کے فرق و تفاوت کو اقبال نے نہایت فصیح الفاظ میں بیان کیا ہے:

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بال بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آں کہ برد دانہ افتادہ ز خاک
آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است

دگر است آں کہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم
آنکہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است

دگر است آنسوے نہ پردہ کشادن نظرے
ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ فرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست!

(پیامِ مشرق)

'حکمتِ ایمانیان' کے ان بنیادی بصائر کو تمہیں سمجھا دینے کے بعد اب ہم تمہیں "حکمتِ یونانیان" کی طرف لے چلتے ہیں۔ "حکمت ایمانیاں" سے تمہارا قلب منور ہو نے کے بعد عقلِ خود بین کا غلام نہیں بن سکتا۔ قلبِ سلیم یا عقلِ جہاں بیں سے اب تم حکمت یونانیاں' یا عقلِ خود بین کی یافت پر نظر ڈالو۔

فلسفہ کیا ہے؟[1]

"نامد خبرے کہ از کجا ئیم ہمہ وز بہر چہ در حیات مائیم ہمہ
چوں در تنہ خاک می روئیم آخر پس ما بہ سرِ خاک چرا ئیم ہمہ" (حکیم افضل الدین کاشانی)

فلسفہ؟ وہی تجریدات کا گورکھ دھندہ؟ وہی لِمَ ولا نُسلِّم کا دعویٰ؟ وہی اثیری تخیلات جو منت کشِ معنی نہیں؟

اُلجھن شاید سب ہی کو پیدا ہوتی ہے کہ آخر فلسفہ صرف بحث و مباحثہ ہی کا نام ہے جہاں بحث صرف بحث ہی کی خاطر کی جاتی ہے، یا اس بحث کا کوئی موضوع بھی ہوتا ہے جو واضح، صریح، متعین ہو؟ سب جانتے ہیں کہ علم ہیئت میں اجرام سماوی سے بحث کی جاتی ہے تو ارضیات میں زمین اور چٹانوں سے، نفسیات کا موضوع ذہن یا نفس ہے جہاں احساس، ارادہ اور عقل کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے۔ "خود را بشناس" کے حکیمانہ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہم پوچھتے ہیں کہ جذبات کا زور مردافگن کیوں ہوتا ہے، عقل ان کے شور و شور پر کہاں تک غالب ہو سکتی ہے، شعور کے کیا معنے ہیں، تسلسلِ ذات سے کیا مُراد، وغیرہ۔ بہر حال یہ تمام علوم واقعات کے ایک متعین دائرہ سے بحث کرتے ہیں، یہ واقعات نہایت اہم و دلچسپ ہیں، علمی و عملی لحاظ سے ان کا فائدہ مسلّم ہے لیکن فلسفے میں کس چیز سے بحث ہوتی ہے؟ استدلالیوں کی یہ چناں و چنیں، یہ لِم و نُسلّم آخر کس چیز کے متعلق ہے؟ کیا ہم نے نہیں سُنا کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود؟

---

[1] یہ مقالہ اور بعد کے دو مقالات اول مرتبہ برہان میں اگست ستمبر اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئے۔

سوال بالکل جائز ہے، اور ہمیں ابتدا ہی میں اس کے جواب کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ آپ سچ بتلائیے کہ آپ میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو زمین اور چٹانوں، اجرام سماوی اور اعمال ذہنی اور دوسرے مخصوص و متعین حالات کے مطالعے سے کبھی نہ کبھی بیزار یا پریشان نہ ہو گیا ہو اور یہ کہتے ہوئے کہ "صد کتاب و صد ورق در نار کن" یہ نہ پوچھا ہو کہ آخر یہ سب کچھ کا ہے کے لیے ہے؟ اس جھگڑے کا انجام؟ اس کی قدر و قیمت؟ اس کے معنے و مقصود؟ "پس فائدہ در جہاں بے فائدہ چیست؟"

جب آپ اس دنیا کے مخصوص و متعین واقعات سے پریشان ہو کر خود دنیا کے معنے و مقصود، اس کی قدر و قیمت و اہمیت اور فرد و عالم کے تعلق کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ اسی بدعت کے مرتکب ہوتے ہیں جس کے ارتکاب پر آپ فلسفیوں کو "آوارہ و مجنونے رسوا سر بازارے" قرار دیتے ہیں۔

براؤننگ کہا کرتا تھا کہ زندگی معنے رکھتی ہے اور اسی معنے کا دریافت کرنا میری غذا، میرا کھانا پینا ہے۔ براؤننگ فلسفی تھا۔ فلسفے کی یہی تعریف ہے کہ "یہ معانی اور قیمتوں کا مطالعہ ہے" یہ حیات کی "توجیہہ و تعبیر" ہے۔

فلسفی حیات من حیث کل کا ثابت قدمی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، اس نقطہ نگاہ وسیع ہوتا ہے وہ کسی خاص محدود نقطۂ نظر سے زندگی پر غور نہیں کرتا بلکہ بقول فلاطون "سارے زمان و مکان کا ناظر ہوتا ہے" کسی شے پر فلسفیانہ طور پر نظر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں وسعت ہو، اس شے کو دوسری تمام اشیاء کے ساتھ رکھ کر دیکھیں، تناسب کا پورا خیال ہو ہم اسکی توجیہ میں ڈاکٹر جانسن کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کرینگے جس کو باسول نے بیان کیا ہے۔ باسول نے ایک روز جانسن اور اس کے چند رفقاء کی اپنے مکان پر دعوت کی۔ دعوت کے ایک روز قبل باسول کے لانڈ لارڈ نے اس کو اپنی انتہائی بدمذاقی سے مکان پر زیادہ آدمیوں کو مدعو کرنے کی اجازت نہیں دی۔ باسول نہایت آزردہ خاطر ہوا، اور جانسن کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ جانسن نے یہ سن کر خندہ

پیشانی کے ساتھ اپنے خاص انداز میں کہا کہ "جناب ذرا سوچیے تو سہی یہ واقعہ کوئی بارہ مہینے بعد کس قدر حقیر معلوم ہوگا!" جانسن فکر و نظر کی رو سے نہ سہی، کردار و عمل کے لحاظ سے یکّا فلسفی تھا، اس نے فوراً یہ دیکھ لیا کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کے بیشمار واقعات پیش آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، ان میں صرف ایک پر تمام توجّہ کو مرکوز کرنا اس کے تناسب کو نظر انداز کرنا ہے، نگاہ میں تنگی پیدا کرنا ہے۔ فلسفی واقعاتِ عالم کو اپنے اپنے تناسب کے لحاظ سے دیکھتا ہے، کُل میں ہر ایک کو مناسب جگہ دیتا ہے، جانب داری، تعصب، تنگی، اس کی نگاہ میں نہیں پائے جاتے، بہ الفاظ دیگر وہ زندگی کو "کلیت کی روشنی" میں دیکھتا ہے۔

بعض دفعہ فلسفے کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ حکیمانہ طریقوں کی مدد سے اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں"

ہماری اس مانوس دنیا کو جس میں ہماری بود و باش ہوتی ہے علوم مخصوصہ کے تمام نتائج و تعمیمات کی مدد سے پوری طرح سمجھنا طالیس کے زمانے سے جو یونان کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے اب تک فلسفے کی غایت رہی ہے۔ دنیا بہت مانوس تو نظر آتی ہے لیکن آخر "دنیا" سے مراد کیا ہے؟ یونان کے اہلِ نظر دنیا یا کائنات کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ اور ہر زمانے کے فلسفیوں نے نہایت ہمت و جرأت کے ساتھ اس عظیم الشان کائنات کی کنہ یا ماہیت کے پتہ لگانے کا کام اپنے سر لیا، کسی فلسفیانہ مزاج شاعر ہی نے تو یہ کہا تھا ؎

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے   میرا ہی دل ہے جہاں تو سما سکے

تو پھر کائنات کی وسعت و مرور یعنی مکان و زمان کی نوعیت کیا ہے، اس لاتناہی زمان و مکان والی کائنات کے خالق کا نشان کہاں، اس کا مقصد و غایت کیا اس کا مایۂ خمیر کیا، اس کا حضرت انسان، اس کی روح اور اس کے منتہا سے تعلق

کیا ہے ؟ یہ وہ انتہائی وابدی سوالات ہیں جن کے جواب کی تلاش میں دمیقراطیس اور فلاطون اور ارسطو، سینٹ اگسٹائین، برونو، ڈیکارٹ، سپنوزا، کانٹ، ہیگل اور ہربرٹ اسپنسر، اور دیگر اکابر فلاسفہ نے اپنی جانیں دیں اور یہی عظیم الشان سوالات اب تک قابلِ غور ہیں اور وارفتگانِ عقل کے لیے ہمیشہ رہیں گے !

موجودہ زمانے میں ہمارا نقطۂ نظر زیادہ تر انفرادی واقع ہوا ہے، ہم دنیا پر ہیئتی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشری، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اس کی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ قدمائے یونان کو ثبات و تغیرِ عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا لیکن تغیر سے ان کی مُراد مادّی تغیر تھا یعنی مادّی ذرات یا اجزا کی حرکت یا نشوونما، زوال و فنا کے مظاہر، چنانچہ زینو کا خیال تھا کہ قدرت کے کارخانے میں تغیر محال ہے، حواس کو بہ ظاہر جو تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب والتباس ہے، لیکن ہرقلیتوس کا یقین تھا کہ ثبات وسکون کائنات کی کسی شے میں نہیں، دنیا سرتاپا تغیر، تجدّد، تنوع ہے۔ یہ اور اس قسم کے مسائل اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک لاجواب ہیں، لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کسی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہوگئی ہے، ہم معاشری رسوم، سیاسی علائق، اخلاق وآداب، مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادّی کی تغیرات والی دنیا، لہذا فلسفے کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفۂ حیات، اس کی قدر و قیمت، اس کی بدایت ونہایت و غرض وغایت کی توجیہ کرتا ہے۔ اس لیے ارتقا، ترقی، ذہن کے طریقے، کردار ومعاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہوگئے ہیں لیکن یہ ہمیشہ کے لیے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔

شاید قارئین میں سے بہت کم ایسے ہونگے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے

سوالات کو نہ اُٹھایا ہو گا: کیا خدا کا وجود ممکن ہے یا سوائے مادّہ اور انرجی کے کوئی شے نہیں؟ مادّے کا مایۂ خمیر کیا ہے؟ کیا درد سے زیادہ کوئی چیز حقیقی ہوسکتی ہے؟ اگر جلوہ فرمائی صرف مادّے کی ہے تو درد کیا چیز ہے، کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا؟ تو کیا ذہن مادّے سے جدا نہیں؟ میرا غور و فکر کرنا، درد و الم سہنا کیا صرف مادی جسم ہی سے تعلق رکھتا ہے، مادی جسم ہی کا وظیفہ ہے یا اس سے جُدا شئے ہے؟ میں زندہ ہوں، حیات کیا ہے؟ وہ مَے کیا ہے جو بہ قولِ اقبال "تلخ تراو نکوتر ست؟" ایک روز مجھے موت آئیگی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابوالعتاہیہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا ؎

الموت باب وکل الناس یدخلہ[1] — یالیت شعری بعد الباب ما الدار؟[2]

ہم آزاد نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا کہ ع ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی! حافظ کا خیال تھا کہ ع پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند! واقعہ کیا ہے؟ مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض ان میں کے صائب ہیں اور بعض خطا پذیر، صواب و خطا کے کیا معنے؟ ان کے معیار کیا؟ ہم میں سے بعض تلاشِ زر میں سرگرداں ہیں، بعض شہرت کے خواہاں اور بعض لذت کے دلدادہ اور ع خوش باش دمے کہ زندگانی این است و بس کے پیرو۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قیمتیں ہیں؟ ان سے اعلیٰ و ارفع نصب العین موجود ہیں؟ مثلاً رواقیہ نے "طمانیتِ نفس" کو خیر برتر قرار دیا تھا، دنیا کی کوئی مصیبت، دنیا کی کوئی خوشی اطمینانِ خاطر کو صدمہ نہیں پہنچا سکتی، چنانچہ بی تھیوس نے روما کے جیل خانے میں "فلسفے کے تسلی بخش لذات" پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ کیا اسی طرح محبت، فرض، تلاشِ حق، فنونِ لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قیمتیں قرار نہیں دی جاسکتیں؟ ہم یہ تمام سوالات اُٹھا سکتے ہیں، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے؟

---

[1] موت ایک دروازہ ہے جس میں ہر شخص داخل ہوتا ہے۔ [2] کاش یہ مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد مکان کونسا ہے!

علمِ انسانی کے حدود کیا ہیں؟ اس کی اُڑان کتنی ہے؟ علاوہ ازیں فطرت وصنعت میں خوب صورت اشیا میرا محاصرہ کیے ہوئے ہیں، اکثر بد صورت بھی ہیں، حسن کیا ہے؟ ایک خوب صورت عمارت میں، ایک حسین چہرے میں، موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہو رہے ہیں؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں، ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت لباسِ حُسن سے ملبوس ہوتی؟ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں، ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، ان پر غور و فکر کرنا، حکیمانہ طور پر، تدقیق وتحقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا، ان کے جواب فراہم کرنے کی سعی کرنا، گو یہ سعیِ لاحاصل سہی، فلسفہ ہے، یا جیسے فلسفے کے شیدائی ولیم جیمس نے کہا ہے" فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے"۔ یہ کام دیوتاؤں کا نہیں، جانوروں کا نہیں، انسان کا ہے، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پروفیسر ہو یا تاریخ کا!

اِن سوالات کا مبدء تجسس و استعجاب ہے، انسان کی وجہ امتیاز یہی تجسس کا جذبہ ہے اور اسی کو فلاطون نے فلسفے کا مبدء قرار دیا ہے، فلاطون کے ہم وطنوں نے اپنی زندگی فلسفے کے لیے وقف کر دی تھی، لیکن ہمارے مقابلے میں ان کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر سادہ اور طفلانہ تھا، تاہم ان کی طبیعت میں تعجب زیادہ تھا، وہ دنیا کی ہر شے، ہر منظر پر استعجابانہ نظر ڈالتے تھے اور بہت جلد ان کے اس استعجاب و تحیّر نے ان کو فلسفے کی راہ پر لگا دیا، اس زاویۂ نگاہ سے ہم فلسفے کی اس طرح تعریف کر سکتے ہیں کہ" یہ وہ استعجاب ہے جو سنجیدہ و متین فکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے"۔

ایک چھوٹی لڑکی دریچے سے مُنہ نکال کر غور و خوض کے ساتھ راہ رؤں کی وارفتہ حرکات دیکھ رہی تھی، ایک دم وہ پلٹی اور اپنی ماں کے مُنہ سے مُنہ ملا کر پوچھنے لگی" اماں میری سمجھ میں یہ نہیں آتا، تم ہی بتلادو کہ یہ سب لوگ کہاں سے آئے، یہ دنیا کہاں سے آئی؟" اس معصوم جان کا اس طرح فکر کرنا فلسفہ ہے! ہم میں سے بہت سارے،

بچے اور بڑے، دنیا کے متعلق کچھ استفسار نہیں کرتے، جیسی بھی ہو قبول کر لیتے ہیں، بہ قول رابرٹ لوئس اسٹیونسن، اس کو دوا کی گولی کی طرح نگل جاتے ہیں، لیکن بعض غور و فکر کرنے والے ہوتے ہیں، انہیں دنیا ایک کہنہ کتاب سی معلوم ہوتی ہے جس کا آغاز و انجام نامعلوم۔ ع اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست، وہ اس کی ہدایت و نہایت کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں اور خود اپنے متعلق پوچھتے ہیں کہ ؎

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم کجا بودم　　دریغ و درد کہ غافل ز کار خویشتنم!

فلسفے کا لفظ یونانی الفاظ سوفیا اور فیلوس سے مشتق ہے جن کے معنے "محبتِ حکمت" کے ہیں۔ سقراط انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو "فلسفی" کہتا تھا یعنے "طالبِ حکمت" جو انسان کی غرض و غایتِ وجود اور اس کے فرائض کی تلاش میں جان تک کو عزیز نہ رکھتا تھا ارسطو کے نزدیک انسانی عقل حکمتِ الٰہی کا ایک جزو ہے، خدا کا علم کلّی ہے، ہماری عقل کا یہ پیدائشی حق ہے کہ یہ بھی کلّی علم کی تلاش کرے، لیکن فلاطون وارسطو دونوں اپنے آپ کو "طالبِ حکمت" کہتے تھے، اور فلسفے کے اس لفظی معنے کے لحاظ سے ہر عاشقِ حکمت فلسفی کہلایا جا سکتا ہے :۔

فلسفے کی اس عام تعریف و توضیح سے جو سطورِ بالا میں کی گئی، آپ کو فلسفے کے معنے دل نشین کرنے میں مدد ملی ہوگی۔ اب ہم چند اکابر فلاسفۂ یونان کے الفاظ میں فلسفے کی مختلف تعریفات پیش کرتے ہیں۔ فلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو سے زیادہ مغربی تہذیب پر شاید کسی اور مفکر کا اثر نہیں ہوا۔ اس لیے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ ان عظیم المرتبت فلسفیوں نے فلسفے کی کیا تعریف کی ہے۔ فلاطون فلسفے کو (سقراط کی طرح) محبتِ حکمت یا محبتِ علم قرار دیتا ہے جو محض رائے زنی یا ظن کی محبت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کے نزدیک فلسفی وہ شخص ہے جو اشیا کے عین و حقیقت سے واقف ہوتا ہے، ظواہر و التباساتِ حواس میں مبتلا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ اپنے مشہور و معروف مکالمۂ

جمہوریت میں لکھتا ہے: "جن لوگوں کو مطلق و سرمدی و عدیم التیغر کی یافت ہوتی ہے۔ انہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ 'علم' رکھتے ہیں نہ کہ محض رائے یا ظن"۔ لہذا فلسفی وہ لوگ ہیں جو 'اس شئے' سے دل لگاتے ہیں جو ہر حالت میں فی الحقیقت وجود رکھتی ہے۔ سرمد نے اپنی زبان میں اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے ؎

دنیا نکنم طلب کہ کمتر زخس است　　　بے دولتِ دیدارِ تو دیں ہم قفس است

خواہانِ وصالم وہمیں ست سخن　　　درخانہ اگر کس ست یک حرف بس ست

فلاطون کی رائے میں علم کا سچا شیدا "صداقت کے حصول میں سعیِ بلیغ سے کام لیگا" اُن کا قلب تنگ ظرفی، بزدلی، حرص، کمینہ پن، اور عاجبیسے صفات ذمیمہ سے پاک ہوگا اور تیزیٔ فہم، حافظۂ قوی، شجاعت و عدالت جیسے صفات سے متصف ہوگا۔[1]

فلسفے کے متعلق ارسطو کا خیال فلاطون کے خیال سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک بھی فلسفہ محبتِ حکمت ہے، علم ہی کی خاطر علم سے محبت فلسفہ ہے۔ فلاطون کی طرح ارسطو نے بھی 'حیرت' کو فلسفے کا مبدء قرار دیا۔ چنانچہ ابتدائی فلاسفۂ یونان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "ابتداءً انہوں نے ظاہری مشکلات پر حیرت کی، پھر رفتہ رفتہ وہ آگے قدم بڑھاتے گئے اور عام معاملات کے متعلق مشکلات کو پیش کیا"۔ ارسطو جس چیز کو فلسفۂ اولیٰ کہتا تھا وہ ان دنوں 'مابعد الطبیعات' کہلاتی ہے۔ اس کی تعریف ارسطو نے اس طرح کی تھی: "فلسفۂ اولیٰ علل اولیہؔ و اصول اولیہ سے بحث کرتا ہے"۔ عملی علم بلکہ جملہ سائنس بھی جو جزئیات سے بحث کرتے ہیں، حواس سے بالکل قریب ہوتے ہیں۔ لہذا ان کا زیادہ آسانی کے ساتھ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ علم افادی مقاصد کے حصول کے لیے سیکھا جاتا ہے۔ لیکن علل و اصولِ اولیہ یا کلیات "انسان کے علم کے لیے سب سے زیادہ سخت ہیں" کیونکہ یہ حواس سے بعید ترین ہیں اور ان کی تلاش وہی لوگ کرتے ہیں جو علم کو

---

[1] دیکھو "ریپبلک" مترجمۂ جوِٹ صفحہ ۴۸۰، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶ و ۴۸۷ وغیرہ۔

علم کی خاطر حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔

ابتدائی یونانی۔رومی عہد میں دو اور فلسفیانہ نظامات پیدا ہوئے جو رواقیت وابیقوریت کہلاتے ہیں۔چونکہ اس زمانے میں سیاسی اور معاشری اختلال پایا جاتا تھا اور ہر سو ہراس و ابتری پھیلی ہوئی تھی اس لیے رواقیہ اور ابیقوریہ کی زیادہ تر دلچسپی حیاتِ انسانی کی قدر و قیمت سے وابستہ ہو گئی۔معاشی و سیاسی اداروں کی تباہی اور مذہب واخلاق کی بربادی کو دیکھ کر انہوں نے یہ سوالات اُٹھائے: "ہماری زندگی کی کیا غرض غایت ہے؟ انسان اپنی زندگی کو کس طرح سُدھارے؟ حقیقی قدر و قیمت کی کونسی شے باقی رہ گئی ہے جس کی تلاش و حصول میں انسان اپنی زندگی بسر کرے؟"

سرگشتہ بہ عالم زپے کیستے؟ ۔۔۔ اے کاش بدانمے من کیستے؟

ورنہ بہزار دیدہ بگریستے! ۔۔۔ گر مقبلِ آسودہ زخوش زیستے (بو علی سینا)

رواقیہ وابیقور کو علومِ نظریہ، نفسیات، ومنطق میں صرف اسی حد تک دلچسپی تھی جس حد تک کہ یہ علوم ذاتِ انسانی اور کائنات سے اس کے تعلق کو سمجھنے میں مدد دے سکتے تھے۔ان علوم کی مدد سے وہ حیاتِ انسانی کے معنے اور اس کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالنا چاہتے تھے۔رواقیہ نے کہا کہ "حکمت" انسانی اور الٰہی چیزوں کا جاننا ہے[1]"۔غرض رواقیہ کے نزدیک فلسفہ نیکی یا فضیلت کو حاصل کرنے کی کوشش ہے جو انفرادی زندگی کو دانائی و حکمت کے ساتھ فطرت کے الٰہی نظام کے ماتحت کرنے اور طبیعیات، منطق و اخلاقیات کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے ؎

خواہی زفراق در فغاں دار مرا ۔۔۔ خواہی زِ وصال شادماں دار مرا

زانساں کہ دلت خواست چناں دار مرا ۔۔۔ من بر تو نگویم چساں دار مرا

رواقیہ کے برخلاف ابیقوریہ کا یقین تھا کہ مسرت غائتِ حیات ہے۔انسان کو اپنی دو روزہ

[1] دیکھو بیکول کی کتاب Source Book of Ancient Philosophy صفحہ ۲۶۹۔

زندگی مسرت و اطمینانِ قلبی کے ساتھ بسر کرنی چاہیے ع خوش باش دمے کہ زندگانی اینست' ایپکورس انسان کو جذبات کی غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہے اور اس کے قلب میں وہ طمانیت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کو دنیا کی کوئی شے برباد نہیں کر سکتی۔ لہذا ابیقوریہ کے نزدیک فلسفہ مسرت کی عقلی تلاش کا نام ہے ؎

دوران فلک روز شباں می گزرد — بس دور گزشت ہمچناں می گزرد
از بہرِ دو روزہ عمر دل تنگ مباش — اے غنچہ شگفتہ شو جہاں می گزرد!"

شعر اور فلسفہ

شعر اور فلسفے کے مقابلے سے فلسفے کے نئے معانی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اکابر شعراء میں سے بعض زندگی کو محض بیان کرنے پر قانع نظر آتے ہیں لیکن بعض اس کی توجیہ و تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی بدایت و نہایت، غرض و غایت، نوعیت و ماہیت کی تشریح کرتے ہیں یہی فلسفی شعراء ہیں۔ روما کا مشہور شاعر لکریشیس فلسفی تھا ایپکیورس کے فلسفے کو اس نے شعر میں ادا کیا، آلہہ کا انکار، حیات بعد الموت کا انکار، طمانیت خاطر اور مسرت، "ماہیت فطرت"ؔ والی شہرۂ آفاق نظم کے ہر شعر سے ظاہر ہے۔ خیام فلسفی شاعر ہے، اسرار ازل، ماہیت کائنات، غایت وجود، راز مسرت کے متعلق اس کے خیالات گو عقل کے لیے نہیں، تاہم تخیل کے لیے نہایت خوش گوار ہیں :-

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من — ایں حرفِ معما را نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو — چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

دیگر

در چرخ بانواع سخنہا گفتند — ایں بے خبراں گوہرِ دانش سفتند
واقف چو نگشتند باسرارِ فلک — اوّل زنخے زدند و آخر خفتند

ؔ De Revum Natura

دیگر

خیام اگر بادہ پرستی خوش باش　　بالالہ رخی اگر نشستی خوش باش
چوں عاقبتِ کارِ جہاں نیستی ست　　انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

ڈانٹے بہت بڑا فلسفی شاعر ہے۔ وہ اپنی Divine Comedy میں ہمیں کائنات کی شکل و صورت سے، انسان کی بدایت و غایت سے، شر کی ابتدا اور اس کے علاج سے واقف کرتا ہے۔ "فردوس" (Paradiso) کے تابناک اشعار میں ہم پڑھتے ہیں کہ قلبِ کائنات سے حُبِ الٰہی کی مستنیر شعاع پیدا ہوتی ہے جس کا مقصد انسان کو معصیتوں سے پاک کرنا ہوتا ہے۔ جرمنی کا زبردست شاعر گیٹے بھی مفکر اور فلسفی ہے اس کی شاعری کا موضوع بھی نجاتِ انسانی ہے، لیکن اس کے نزدیک یہ زہد و تقوےٰ سے نہیں، تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ ورڈسورتھ کو اس "ناقابل فہم عالم کے بارِ گراں" نے عاجز کر رکھا تھا اور براؤننگ "نباضِ قلب" خدا، صداقت و محبت سے ہمیں تشفی بخشتا ہے۔

ان فلسفی شعراء کی حیرتناک دلکشی اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ انسان کے سینے میں اسرارِ ازل کو دریافت کرنے اور اس "حرفِ معمہ" کو پڑھنے کی کتنی زبردست خواہش موجود ہے اور ہم ان شعراء کے کلام سے کس قدر تسلی اور آرام حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کہہ اُٹھتے ہیں۔ اسچی لس، سوفوکلیس، یوری پڈیس سب کے سب حاملِ پیغام، معلم اخلاق و مفکر تھے اور اپنی قوم کو انہوں نے اپنے پیغامات سے جگا دیا۔

زمانۂ حال میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈرامے کس قدر فلسفیانہ بنے جا رہے ہیں۔ ڈرامہ نویس حیات کے عمیق مسائل سے اُلجھ کر انہیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اِبسن اس نئے ڈرامے کا منبع ہے جہاں بجائے شاعر و صناع کے مفکر و معلم کا کام کرتا ہے۔ اِبسن

قدامت کی از کار رفتہ و مضر روایات سے نجات پانا چاہتا ہے اور اس کے ڈرامے کے پڑھنے والوں یا دیکھنے والوں میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس قدر جمالیاتی نہیں ہوتے جس قدر کہ تفکری۔ برنارڈ شا کے ڈراموں میں جمالیاتی عنصر صرف نام ہی کو رہ گیا ہے اور سوائے وعظ و تفلسف کے کچھ نہیں۔ اِبسن، برنارڈ شا، گالس ورتی اور روسی اسکول کے مصنفین کی تصانیف میں جو حیرتناک دلچسپی لی جا رہی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنے شکوک رفع کرنے، زندگی کے اسرار کو پانے کے کس قدر خواہاں و جویا ہیں۔ بہ قول ایک فلسفی کے "ہم مابعد الطبیعیاتی حیوان ہیں" ہم دریافت کرنا چاہتے کہ کشمکشِ حیات کے باطنی اصول کیا ہیں، یہ تنازع ہمیں کس جانب لے جا رہا ہے، کیا انتخابِ فطرت کو رانہ ہے یا کوئی "دستِ غیب" اس کے تحت رہنمائی کر رہا ہے۔ بہرحال شاعری کا یہ فلسفیانہ رجحان اس امر کا بین ثبوت ہے کہ فلسفے اور اس کے مسائل میں جو زندگی کے مسائل ہیں، ہمیں اب بھی گہری دلچسپی ہے اور یہ روز بروز افزوں ہوتی جا رہی ہے۔

فلسفہ اور سائنس

کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ ہم موجودہ نقطۂ نظر سے ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالینگے، اختصاراً ہمارے پیشِ نظر ہوگا فلسفہ اور سائنس میں نہایت قریبی تعلق ہے، دونوں کا مبدٔ و ماویٰ وہی ایک ہے، "حُبِ علم" ان کی ابتدا اور "علمِ حقیقت" ان کا منتہا ہے۔ اب یہ خیال صحیح نہ رہا کہ فلسفیانہ نظامات بغیر مادی علوم کی احتیاج کے تشکیل پا سکتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کا تعلق اس قدر قریبی ہے کہ فلسفہ کا طالب علم علوم مخصوصہ، خصوصاً ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور نفسیات کے کسی قدر علم کو لابدی سمجھتا ہے لیکن ان علوم کا دائرہ

ہر روز وسیع ہوتا جاتا رہا ہے اور ان تمام پر عبور حاصل کرنا کسی کے لیے آسان نہیں، اسی لیے فی زمانا فلسفہ اپنی توجہ زیادہ تر کلیات کی ناقدانہ تحلیل اور قیمتوں اور معانی کے مطالعہ پر مبذول کر رہا ہے۔ تاہم صحیح معنی میں فلسفی تو وہی ہوگا جو تمام علوم مخصوصہ پر مہارت رکھتا ہو۔

سائنس (یا حکمت) لاطینی لفظ ہے جو 'علم' کے ہم معنیٰ ہے، حکیمانہ علم "متیقن، صحیح اور پوری طرح مربوط و منضبط ہوتا ہے"۔ فلسفہ بھی دنیا کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہذا فلسفہ اور سائنس دونوں کا ایک ہی مقصد ہوگا لیکن ان دونوں میں فرق ضرور ہے، اور بعض دفعہ اس فرق کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ سائنس کا کام واقعات کا "بیان" (Describe) کرنا ہے اور فلسفہ کا کام ان کی توجیہ و تعبیر (Interpretation) ہے۔ جے آرتھر ٹامسن نے پیرسن اور دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ:

"سائنس واقعات تجربہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"

مظاہرِ عالم کے ایک مجموعے کا عالمِ سائنس مطالعہ کرتا ہے، وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحلیل کرتا ہے، ان کو ترکیب دیتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے، پھر ان شرائط (یا علل) کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں، ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے یعنی ان کے قوانین کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالے کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالمِ سائنس کے ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی اس نے واقعات تجربہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرزِ وقوع و طریقۂ عمل کو سمجھا دیا۔ سائنس کی اسپرٹ برخلاف عملی و جذباتی پہلو کے مندرجۂ ذیل خصوصیات سے متصف ہوتی ہے:-

ا۔ واقعات اور صداقت کی بے غرضانہ تلاش۔

ب۔ تجربے کی طرف مسلسل توجہ۔

ج۔ بیان میں حزم و احتیاط۔

د۔ بصیرت کی صفائی۔

ہ۔ اشیاء کے باہمی ربط کا خیال۔

اب فلسفہ بھی سائنس کی طرح اسی علم کا متلاشی ہے جو تیقن، صحیح اور مربوط ومنضبط ہو، لیکن وہ محض اسی علم پر قانع نہیں، وہ اس علم کا جویا ہے جس میں جامعیت اور استیعاب ہو۔ مظاہر کے غیر مبدل توالیات، یا قوانین کا تعین ذہنِ انسانی کی پوری طرح تشفی نہیں کرسکتا۔ وہ اشیاء، یا واقعات کی انتہائی توجیہ وتعبیر کا خواہاں ہوتا ہے یعنی وہ ان کی علتِ اولیٰ، ان کی بدائت وغایت ان کے معنی یا قدر وقیمت کا جویا ہوتا ہے۔ سائنس، محض واقعات کے وقوع کے شرائط یا بیان پیش کرتی ہے، لیکن فلسفہ ان کی انتہائی توجیہ یا تشریح کرنا چاہتا ہے، زمانہ حال کے ایک زندہ سائنٹفک فلسفی نے اس چیز کو اچھی طرح ادا کیا ہے: "فلسفہ مختلف علوم وسائنس کے نتائج کو لیتا ہے اور ان کے ساتھ انسان کے مذہبی واخلاقی تجربات کے نتائج کو ملاتا ہے اور پھر ان پر بحیثیت مجموعی غور وفکر کرتا ہے۔ اُمید یہ ہوتی ہے کہ ہم اس طریقے سے کائنات کی کُنہ وماہیت، خود اپنی حیثیت ومقام کے متعلق بعض عام نتائج حاصل کرسکیں" (براڈ)

اس میں شک نہیں کہ فلسفے کے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی خواہش پر اس کی عالمگیر وسعت ہی کی بنا پر علمائے سائنس کی جانب سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے، ضعیف البنیان انسان اس کو حاصل نہیں کرسکتا اس کا تفصیلی جواب ہم آگے چل کر پیش کرنے کی کوشش کرینگے لیکن یہاں صرف

اتنا کہنا ضروری ہے کہ "کل" کو سمجھنے کی کوشش بذاتِ خود موردِ اعتراض نہیں بن سکتی، کیونکہ انسان کو اس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور انسانی دلچسپی کا ہر معرض حکیمانہ تحقیقات کا موضوع بن سکتا ہے بشرطیکہ حکیمانہ طریقے استعمال کیے جائیں۔ اعتراض تو اسی وقت وارد ہو سکتا ہی جب غلط طریقے استعمال کیے جائیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل میں منطقی طریقوں کا استعمال فلسفے کے مطالعے کے وقت نہیں کیا گیا، لیکن ہم آگے چل کر بتائینگے کہ خود سائنس کے مطالعے میں بھی منطقی طریقوں کا استعمال گزشتہ زمانوں میں نہیں کیا گیا۔ فکلا ہما سوا۔

بہر حال طریقوں کی بحث چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفے کے دو جداگانہ مقاصد ہیں اور دونوں سائنس کے عمل سے مختلف ہیں اور دونوں فکر انسانی کی جائز ضروریات ہیں۔ اولاً دنیا من حیث کل پر اور خصوصاً اس کے معنی مقصد یا غایت اور قدر و قیمت پر غور و فکر۔ ثانیاً ان تصورات کلی کا ناقدانہ امتحان جو سائنس اور فہم عام کے استعمال میں آتے ہیں پہلے کو 'فلسفۂ نظری' کہا گیا ہے اور دوسرے کو 'فلسفۂ انتقادی'۔

مقصدِ اول کے متعلق ہمیں یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ذہن انسانی کی یہ عمیق ترین خواہش ہے کہ دنیا و زندگی کے متعلق وہ نقطۂ نظر حاصل کیا جائے جو فلسفے کے لیے مخصوص ہے ہمیں دنیا کا محض ایک کمّی نقطۂ نظر یا محض اس کے ریاضیاتی علایق ہی کا علم درکار نہیں بلکہ اس کی ماہیت یا کیفی و باطنی خصوصیت "اسرار ازل" کا علم مطلوب ہے اس زمانے میں سائنس کے دائرہ میں جتنی بھی تحقیقات ہو رہی ہیں ان سب میں کمّی علایق پر زور دیا جا رہا ہے سب 'کیف' کے جواب سے قاصر ہیں، کمیت کی ناپ تول اور تحقیق و تدقیق جاری ہے۔ حکیمانہ نقطۂ نظر سے سائنس کی یہ تحدید کوئی نقص نہیں کہ وہ کیفیت، معنے و قیمت کے سوال کو اپنے دائرہ بحث سے خارج سمجھتی ہے، لیکن اس کا تکملہ فلسفے سے کیا جانا چاہیے ممکن ہے کہ دنیا

ہیں نہ مقصد ہو نہ غایت، اور نہ اس کی قدر و قیمت ہی کچھ ہو۔ لیکن اس نتیجے تک بھی ہم فکر و نظر کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش ہی کے بعد پہنچ سکتے ہیں اور اسی غور و فکر کا نام فلسفہ ہے۔

مقصدِ دوم (تصورات کی ناقدانہ تحلیل) کے متعلق ہم یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ سائنس اور فہم عام کے بعض ایسے کلّی تصورات ہیں جن کی وہ پوری طرح جانچ پڑتال نہیں کرتے بلکہ محض عملی تعریف کرنے کے بعد اپنے عملی مقاصد کے حصول کے لیے ان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے تصورات کی مثال مکان و زمان، کیفیت و کمیت، علیت و قانون، خیر و شر، وغیرہا سے دی جا سکتی ہے۔ اب فلسفے کا یہ مخصوص کام ہے کہ ان تصوّراتِ کلیّہ کا پوری طرح امتحان کرے، ان کی ناقدانہ تحلیل کرے، اور ان کے معانی و روابط کو بالاستیعاب سمجھنے کی کوشش کرے۔ بہ قول جی آر تھامسن کے "مقولات (تصورات) و مسلمات کی یہ تنقید وہ اہم خدمت ہے جو مابعد الطبعیات سائنس کے حق میں بجا لاتی ہے" برٹرنڈرسل وغیرہ نے اسی کام کو فلسفے کا واحد وظیفہ قرار دیا ہے۔ ان دنوں یہ نہایت اصطلاحی چیز ہو گئی ہے اور ہم سرِ دست اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔

فلسفہ اور مذہب

ہم فلسفہ اور مذہب کے باہمی تعلق پر اس لیے غور کر رہے ہیں کہ فلسفے کی اہمیت اور اس کی افادیت اور زیادہ واضح اور اُجاگر ہو جائے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں بیر ہے۔ واقعہ اس کے خلاف ہے، مندرجۂ ذیل مختصر واقعات سے آپ خود اس کا اندازہ کر سکینگے:۔

فلسفہ اور سائنس میں جس قسم کا تعلق بتلایا گیا، اس سے فلسفہ اور مذہب کا

تعلق جداگانہ ہے۔ فلسفہ کائنات من حیث کل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ دنیا کے متعلق سائنس سے زیادہ جامع، کامل اور وحدت بخش علم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن مذہب کو اس سے بھی زیادہ کامل وحدت کی تلاش ہے، فلسفہ ایک ایسے تصوّر کی تلاش کرتا ہے جو ہماری مضطرب عقل کو دنیا کے معنے سمجھا دے لیکن مذہب فرد اور عالم کی حقیقی وحدت اور ان کے وفاق کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، مذہب میں ہماری کوشش مبدء عالم کے ساتھ ایک ہو جانے کی ہوتی ہے، ہم اس میں محو ہونا چاہتے ہیں اور اس طریقے سے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ مذہب کا کام انسان کو دنیا میں طمانیتِ نفس وجمعیتِ خاطر بخشنا ہے، لیکن سائنس اور فلسفہ بھی ہمارے علم میں پہنائے عالم پیدا کرنے اور لذتِ وقوف بخشنے کی وجہ سے قلب میں ایک خاص قسم کی طمانیت پیدا کرتے ہیں۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب یہ تینوں دنیا کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی غایتِ مشترکہ قرار دی جا سکتی ہے، لیکن اس علم سے ان کی غرض جدا جدا ہے۔ سائنس کی غرض علم کو علم ہی کی خاطر حاصل کرنا ہوتی ہے، لیکن زیادہ تر یہ علم کو عملی واقتصادی اغراض کے تحت رکھتی ہے۔ فلسفے کی غرض محبتِ علم اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی طمانیت و لذت ہوتی ہے۔ مذہب کائنات کو اس لیے سمجھنا چاہتا ہے کہ روح انسانی کو جمعیت، چین اور نجات حاصل ہو۔ بعض وقت فلسفہ اور مذہب ان ہی تصورات سے بحث کرتے ہیں۔ مثلاً روح، اس کی بدایت وغایت، خدا اور تخلیق، لیکن یہاں بھی ان دونوں کے اغراض جدا جدا ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر میں یہ نظری اور عقلی ہیں اور ثانی الذکر میں یہ جذبی اور شخصی!

فلسفہ نظر و فکر کرنے والے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے، فرد اس میں "فکر" کی وجہ سے حصہ لیتا ہے، لیکن مذہب پر وہ "ایمان" رکھتا ہے، یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے،

کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ مذہب زندگی کے وہبی، جذباتی و حسّی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہوتا ہے۔ فطرتِ انسانی کا یہ پہلو ابتداہی سے عادات و وجدانات میں مضبوطی پکڑ لیتا ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل پیدا کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔

لیکن آخر مذہب کیا ہے؟ اگر اس کی تعریف ناممکن ہے تو کسی قدر معنی کا تعین تو ضرور ہو سکیگا۔ مذہب پر جب آپ غور کرتے ہیں تو شاید ائتلاف کی وجہ سے مسجدُ حرم دیر و کلیسا، مصلیٰ و ناقوس، تسبیح و زاہد خیال میں آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ضروری طور پر مذہب تو نہیں۔ اب مذاہب عالم پر نظر غائر ڈالیں اور ان کے اجزائے مشترکہ پر غور کریں تو ہم مذہب کی کسی تعریف تک پہنچ سکینگے، شاید وہ کچھ اس قسم کی ہو۔

"مذہب غیب کی ان قوتوں پر آسرا کرنے کے احساس کا نام ہے جن کی قدرت میں ہماری قسمت کی باگ ہے، ساتھ ساتھ ان قوائے غیبی سے صادقانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے[1]" یا مذہب ایک غیر مرئی روحانی نظام سے ہمارے عملی تعلق کا شعور ہے۔"

"مذہب ہمارے باطن کے اعلیٰ ترین جوہر کے ساتھ وفا شعاری کا احساس ہے"

ایمرسن نے خوب کہا ہے کہ "میں، ناقص 'میں' اپنے کامل 'میں' کی پرستش کرتا ہوں"۔ ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بنیاد اعلیٰ قیمتوں کے عمیق جبلی احساس پر ہوتی ہے۔ ہماری ذات میں جو الٰہیت کا جوہر مکنون و مستتر ہے وہ اس جوہر الٰہی کی طرف بڑھتا ہے جو ہم سے ماورا، سارے عالم پر محیط ہے۔ یا مذہب ان ہی اعلیٰ و انتہائی قیمتوں کی طرف اس خاک د باد کی دنیا اور اس کے آلام و لذائذ سے بلند ہو کر دیکھنا اور ان کی طرف باطنی ہمدردی اور شناخت کی وجہ سے کھنچ جانا ہے۔ اسی بنا پر پروٹ نے کہا ہے کہ ہم ان

---

[1] جے۔ بی۔ پراٹ کی کتاب Religions Consciowness صفحہ (۱) مطبوعہ میکملن کمپنی ۱۹۲۰ء

احساسات یا تصورات کو مذہبی کہینگے جو ایک نصب العینی وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں"۔ اسی وجہ سے مذہب کے اسماء، علائم و اشخاص پاک و مقدس سمجھے جاتے ہیں، یہ برترین قیمتیں ہیں دنیا کی معمولی و ادنیٰ چیزوں سے ماوراء ہیں، اور اسی لیے مذہبی پہلو وفا شعاری، تکریم، تواضع و زہد کا ہوتا ہے۔

مذہب کی اس تعریف کے لحاظ سے روح، روحانی یا روحانیت کے الفاظ میں کسی قسم کا سِتر و غموض نہیں پایا جاتا۔ یہ ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی اعلیٰ قیمتیں ہوتی ہیں، چنانچہ جارج سنیٹانا کہتا ہے کہ روحانی ہونے سے مراد نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنا ہے"۔ ڈریک نے اپنی کتاب "مسائلِ مذہب" میں روحانیت کے معنے اور مذہب سے اس کے تعلق کو بڑی اچھی طرح ظاہر کیا ہے:۔

"قلب و ارادے کا وہ میلان جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ چیزوں کی پروا کرتا اور رفق و ملائمت و طمانیت باطنی کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور حیات کے سطحی واقعات سے متاثر نہیں ہوتا اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے "روحانیت" کہلاتا ہے، اور جب یہ خارجی صورتوں اور اداروں میں رونما ہوتا ہے اور تمام جماعتوں میں پھیل جاتا ہے تو ہم اس کو "مذہب" کہتے ہیں"[1]۔

اس طرح پر سمجھا جائے تو پھر مذہب کوئی غامضانہ، تحکمانہ یا پُراسرار شئے نہیں رہتا بلکہ وہ ایک حاجتمند روح کی جبلی آواز بن جاتا ہے۔ مذہب انسان کی جبلت میں داخل ہے، وہ ایسی چیز نہیں جس کی صداقت پر ہم معترض ہوں یا اس کی شہادتیں تلاش کی جائیں۔ اس کی بنیاد تو اس امر پر ہے ہم اعلیٰ اقدار یا قیمتوں کے دائرۂ حکومت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان سے ایک قسم کی جبلی ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اور چونکہ مذہب ان اعلیٰ اقدار کو ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رکھتا ہے اور ان میں دنیا کے

[1] "مسائل مذہب" صفحہ (۲۴۴)

لذائذ و رغائب کے باوجود فراموش ہونے نہیں دیتا، اس لیے مذہب انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ خوبصورت شئے ہے۔

مذہب اور فلسفے کا تعلق کتنا قریبی ہے وہ اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ اگر مذہب کی یہ تعریف کی جائے کہ یہ ان روحانی اقدار یا قیمتوں کا استحکام ہے جو روحِ انسانی میں ہمیشہ موجود ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات خفتہ حالت میں ہوتی ہیں تو پھر فلسفے کا یہ کام ہو گا کہ وہ ان قیمتوں کی تحقیق کرے، ان کے مبدء و ماخذ کا پتہ چلائے، ہم نے ابتدا میں فلسفے کی تعریف ہی یہ کی تھی کہ فلسفہ "معانی اور قیمتوں کے مطالعہ کا نام ہے"۔

اور اگر مذہب روحِ انسانی کا کائنات کی اعلیٰ قوتوں کو لبیک کہتا ہے تو فلسفے کا کام یہ ہو گا کہ ان الٰہی قوتوں کے وجود کے دلائل و براہین پیش کرے، یا اگر مذہبی پہلو کے لیے اس امر کا یقین کرنا کسی طرح ضروری ہے کہ اشیاء کے پس پردہ کوئی الٰہی قوت ہے جو فطرتِ انسانی سے کوئی نہ کوئی شئے مشترک رکھتی ہے جس کو ہم نہایت احتیاط کے ساتھ شخصی کہہ سکتے ہیں، تو فلسفے کا یہ فریضہ ہو گا کہ اس امر کا تعین کرے کہ سائنس یا مابعد الطبیعیات میں کوئی ایسی چیز تو نہیں جو ہمیں اس شخصی قوت کے وجود پر یقین کرنے سے باز رکھے، یا اگر سائنس یا مابعد الطبیعیات میں کوئی وجہ اس پر یقین کرنے کی ملتی ہے تو وہ کیا ہے؟

یہ اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کا مذہب پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہمارے خیال میں یہ اثر نہایت مفید ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً فلسفے کا مطالعہ ہمارے بعض مذہبی عقائد و خیالات میں کسی قدر خلل پیدا کرے، خصوصاً ہمارے یہ عقائد بالکل کوتاہ ناقابلِ مصالحت ہوں۔ لیکن اگر یہ وسیع کشادہ اور سادہ ہوں تو فلسفہ ان کی تائید کرتا اور انہیں تقویت بخشتا ہے۔ بیکن نے کہا ہے کہ "یہ صحیح ہے کہ تھوڑا سا فلسفہ انسان کے ذہن کو الحاد کی جانب مائل کرتا ہے، لیکن فلسفے میں تعمق انسان کے ذہن کو مذہب

کی طرف رجوع کر دیتا ہے" دراصل فلسفے کا یہ کام ہے کہ وہ ہمارے اساسی مذہبی اذعانات کو عقل کی "بنیانِ مرصوص" پر مستحکم طور پر قائم کر دے تاکہ جبلّی تیقنات اور "دین العجائز" مادیت والحاد کے طوفان میں غرق نہ ہو جائیں۔ بعض دفعہ ہمارے ان جبلّی احساساتِ مذہبی میں ارتعاش ہوتا ہے اور ہمیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "نجس" سائنس ہمارے ان اذعانات کو برباد کر دے۔ فلسفہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتا ہے اور ہم وہاں سے شک وریب کی وادی پر نظر ڈالتے ہیں، علم سے ہمیں قوت حاصل ہوتی ہے، خوف رفع ہوتا ہے، جس چیز کو ہم نے بدترین سمجھا تھا، وہ اپنے پورے خدوخال، پورے تناسب میں کچھ بُری نہیں معلوم ہوتی، پھر ہمیں جو طمانیت وسکون حاصل ہوتا ہے وہ ابدی ہوتا ہے۔

فلسفے کے امکان کا سوال

فلسفے کو شاعری، سائنس اور مذہب کے تقابل سے آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھا، "فلسفیانہ مسئلہ" یا موضوع کو مشکل کیجیے تو اس کی وسعت سے آپ کو ایک قسم کا خوف یا تحیر ہوگا۔ حقیقت کی کُنہ یا ماہیت، کائنات کے معانی ومقصود، اس کی بدائت ونہایت، حیات کی قدر وقیمت، یہ ایسے عظیم الشان سوالات ہیں کہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا اور کسی قسم کا حل پیش کرنا بڑی ہمت کا کام ہے! عالمِ سائنس جو دنیا کے ایک گوشہ کو لیتا اور اس کو پوری طرح سمجھنے میں اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دیتا ہے وہ فلسفی کے دائرۂ بحث کے پھیلاؤ اور کشادگی کو دیکھ کر کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے انسان کا نہیں کیونکہ ؎

من می نگرم زبتدی تا اُستاد — عجز نست بدست کہ از مادر زاد

لیکن خود یہ عالم سائنس جانتا ہے کہ اس کا دائرۂ بحث کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو دوسرے

علوم کے دوائر سے کچھ اس طرح مربوط ہے کہ خواہ مخواہ اس جزو کے کامل علم کے لئے "کل" کا مطالعہ ضروری ہے اور اس طرح وہ مجبوراً فلسفے ہی کے دائرہ میں قدم زن ہوتا ہے، یا کم از کم فلسفی پر اعتراض کرنا ترک کر دیتا ہے۔

تاہم مفکرین کے بعض گروہ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے فلسفیانہ مسائل کی وسعت سے گھبرا کر اس کے مطالعہ ہی سے انکار کر دیا ہے، ان میں سے ہم دو کا اختصار کے ساتھ ذکر کرینگے۔ ایک ایجابیت اور دوسری ارتیابیت۔

ایجابیت

فرانس کے فلسفی اگسٹ کامٹ (۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۷ء) نے دنیا کے متعلق اپنے نقطۂ خیال کا نام ایجابیت رکھا ہے، گو حقیقت میں یہ خود فلسفی ہے جو فکر کی مستقل اور غیر معمولی کوشش کے بعد دنیا کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر تک پہنچا ہے، لیکن وہ فلسفے کے نام سے بیزار ہے۔ اس کا یقین تھا کہ علت العلل یا علت اولیٰ، آخری یا انتہائی حقیقت اور اس قسم کی ساری چیزوں کی تلاش محض فضول ہے۔ انسان کے ذہن کی رسائی ان حقائق تک نہیں ہو سکتی، وہ تجربے کے واقعات یا مظاہر اور ان کے توافقِ عمل یا قوانین ہی تک محدود رہتا ہے۔ ظواہر کے پس پردہ کیا ہے اور اشیاء کما ہی کی حقیقت کیا ہے، یہ سب مابعد الطبیعیاتی تجریدات ہیں، ان سے احتراز ہی مفید ہے، فلسفے کا کام ظواہر کے باہمی تعلقات اور ان کے غیر متبدل طریقِ رفتار کا دریافت کرنا ہے نہ کہ تجریدی تصورات کے گورکھ دھندوں میں الجھنا!

کامٹ کی ساری دلچسپی عمرانیات ہی سے تھی، وہ اپنے کو اس علم کا موجد سمجھتا تھا۔ اس کا نصب العین سوسائٹی کی اصلاح تھی، اس نصب العین کا تحقق معاشرت کے قوانین کے علم ہی سے ہو سکتا ہے۔ لہذا کامٹ معاشرت کا سائنٹفک طریقوں سے مطالعہ

کرنا چاہتا تھا اور اسی کو وہ فلسفہ جدید قرار دیتا تھا۔ اس لیے ایجابیت کا مطلب صرف اتنا ہوا کہ سائنس فکر انسانی کی آخری منزل ہے، اور سائنس کا مقصدِ وحید واقعات تجربیہ کے باہمی مستقل علائق اور ان کے قوانین دریافت کرنا ہے، اور یہ مشاہدہ اور تجربے ہی سے ممکن ہے۔ سائنس ان چیزوں سے بحث کرتی ہے جو تیقن و مفید اور قطعی ہوتی ہیں اور خصوصاً جو ہمارے معاشری اداروں کی تکمیل کے لیے مفید ہوتی ہیں، یہ علم ایجابی ہے، اسی کی تدوین ایجابیت کا کام ہے۔

سائنس کی قدر و قیمت کے متعلق ہر شخص کو کامت کے ساتھ اتفاق ہوگا، نیز علوم معاشریہ کی اہمیت کے متعلق بھی کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن کیا ہم اُس کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کر سکتے ہیں کہ فلسفے کے وسیع مسائل کا مطالعہ فضول ہے اور مابعد الطبیعیات پر وقت صرف کرنا رائیگاں؟ اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

اِرتیابیت

دوسرا گروہ جو ہمیں فلسفے کی منزلِ مقصود کی طرف قدم اُٹھانے سے باز رکھتا ہے وہ ارتیابیہ کا ہے۔ خیام کی زبان میں کچھ اس طرح ہم اس مسلک کو ادا کر سکتے ہیں:۔

دورے کہ درو آمدن و رفتنِ ماست — او را نہ نہایت و بدایت پیدا است

کس می نہ زند دمے دریں معنی راست — کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

ارتیابیت کا ظہور پہلے یونان میں سوفسطائیہ کے دور میں ہوا۔ غورجیاس کی تعلیم "سفسطہ" کا نمونہ ہے "کسی شئے کا وجود نہیں، اگر وجود ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں، اگر اس کا علم بھی ہے تو یہ دوسروں تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ ہستی کا انکار، علم کا انکار، اس سے زیادہ انکار و ارتیاب کیا ہو سکتا ہے؟ چند دن بعد یونانی رومی دور

میں ارتیابیت فلسفے کا ایک مستقل "اسکول" بن گئی جس کا بانی "پرہو" تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان مفکرین نے سقراط، افلاطون، ارسطو، دمیقراطیس جیسے جلیل القدر فلسفیوں کے بعد جنم لیا، اور گو اہل یونان نے اب تک مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، منطق، ریاضیات میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں تاہم اُنھوں نے "پردۂ محمل" تک پہنچنے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک فلسفہ ادعای تھا، ذہن انسانی نے ملکۂ علم کی تنقید کے بغیر یہ مان لیا تھا کہ حقیقت کا علم ممکن ہے۔ لہذا یہ اکابرِ فلاسفہ کے مختلف و متضاد خیالات و نظریات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے اور کہتے کہ عقدۂ کائنات لاینحل ہے، صداقتِ کلّی ناقابل حصول۔ ہاں "انسان (فرد) ہر چیز کا معیار ہے" "جتنے آدمی اتنے ذہن" ہماری رایوں میں یکسانیت ممکن نہیں، لہذا علم کلّی کا امکان بالکل نہیں۔ فرد علم کے معاملہ میں اپنا قانون آپ ہے۔ اس نظری ارتیابیت سے اخلاقی ارتیابیت بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ جب علم ہی کا امکان نہیں تو صواب و خطا کا علم کہاں، کلّی طور پر صواب و خطا کا وجود نہیں، جو چیز تمہارے لیے اچھی ہو ضروری نہیں کہ وہ میرے لیے بھی اچھی ہو۔ ضمیر شخصی معاملہ ہے۔ یہی حال جمال کا ہے، اس میں بھی کوئی مشترک معیار نہیں۔ کیا تمہیں اس حبشی کا قصہ یاد نہیں جو اپنے بادشاہ کے اس حکم کی پیروی میں کہ سب سے زیادہ حسین بچّے کے گلے میں موتیوں کا ہار پہنایا جائے، بہت سی تلاش کے بعد اپنے ہی بچہ کے گلے میں پہنا دیا اور عرض کیا کہ جہاں پناہ میری نگاہ میں اس حبشی زادہ سے زیادہ خوبصورت آپ کی ساری وسیع مملکت میں کوئی بچہ نہیں!"

زمانۂ جدید میں یونان کی سی ارتیابیت بالکل مفقود ہے۔ ارتیابیت کا سب سے آخری حامی اڈنبرا کا مشہور عالم مفکر ہیوم تھا (۱۷۱۱ء تا ۱۷۷۶ء) لیکن اس کی ارتیابیت ایسی تباہ کن اور انتہائی نہ تھی جیسی کہ یونانی ارتیابیت، بلکہ یہ حدودِ علم کی ایک ناقدانہ

تحقیق و تدقیق تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے علم کا مبدٔ تجربہ ہے، اس کی انتہا عالمِ مظاہر اور ایک قسم کی "لاادریت" کہ علل انتہائی، روح، الیغو، وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔

موجودہ زمانے کی اسپرٹ تو یہ ہے کہ جدید مسئلہ کا امید و رجا کے ساتھ پیہم مقابلہ کیا جائے، فلسفیوں کا باہمی اختلاف ممکن، علم انسانی کی غلطی ممکن، ہمارے حواس کا التباس ممکن، لیکن ہم یہ ضرور دریافت کرکے رہیں گے کہ کونسا فلسفی صحیح ہے، حواس کا دھوکہ کس طرح دور کیا جا سکتا ہے، علم کی غلطی کیسے رفع ہو سکتی ہے۔ زمانۂ جدیدہ کی روح جرأت و جوش سے مملو ہے، قطب جنوبی کی دریافت کا بیڑا اُٹھایا، تلاش میں جانیں گئیں، لیکن باوجود ہر طرح کے آفات و مصائب کے اس کو دریافت کر ہی لیا۔ مونٹ ایورسٹ کی چوٹیاں ابھی زیر قدم نہیں آئی ہیں، لیکن اہل ہمت اس کی طرف بڑھے جا رہے ہیں۔ ایک نہ ایک روز یہ زیر قدم آرہینگی۔ یونیورسٹی کی شرکت کے وقت طلبا ان مضامین کو زیادہ پسند کرتے ہیں جن میں مسائل زیادہ دریافت طلب ہوں۔ موجودہ فکر و تفلسف میں شک ضرور پایا جاتا ہے، لیکن یہ ہمیں لوری دے کر بستر راحت پر نہیں سُلا رہا ہے، بلکہ اقبال کی زبان میں کہہ رہا ہے:۔

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست   نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست   بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

براؤننگ کہتا ہے کہ "شک کی میں قدر کرتا ہوں، حیوانات میں یہ نہیں پایا جاتا، ان کی محدود مٹی میں اس شعلۂ مستنیر کی تابناکیاں کہاں؟ برٹرنڈ رسل اس رہا کن آزادی بخش "شک" کا ذکر کرتا ہے جو ادعائیت کو پست ہمت کرتا اور ہمیں راہ عمل میں جری بناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فلسفہ ان لوگوں کی مفتخرانہ ادعائیت کو دور کرتا ہے جو آزادی بخش شک کے دائرہ میں قدم زن ہوتے ہیں، یہ مانوس اشیاء کو غیر مانوسیت کے

جامہ میں پیش کر کے ہمارے احساسِ تحیر کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے" ان جری روحوں کو ان بزدلوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو محض اس خیال سے کہ چونکہ فلسفیانہ سوالات کے جواب نہیں دیے جا سکتے لہذا اِن کو اُٹھایا ہی نہ جائے اور نہ ان کے حل کی کوشش کی جائے۔ فلسفے کی راہ میں طالب علم کو شک بلکہ دہشت ہوتی ضرور ہے، لیکن شک کا پیدا کرنا، صداقت کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں ہونا اور اس کے حصول کی اُمید رکھنا۔ یہ روحِ انسانی کا عظیم الشان کارنامہ ہے!

اِن دنوں ہم ارتیابیت کی بجائے لاادریت کا زیادہ ذکر سنتے ہیں۔ اس لفظ کو سب سے پہلے ہکسلے نے رواج دیا لیکن یہ ہربرٹ اسپنسر کے نام سے زیادہ تر وابستہ ہے، اس کے لفظی معنے ہیں "علم کا نہ ہونا" لاادری، یعنی میں نہیں جانتا۔ اسپنسر کا یقین تھا کہ علم میں ایک قسم کی اضافیت پائی جاتی ہے، لہذا علم مطلق کا امکان نہیں سارا علم اضافی ہے۔ قانونِ اضافیت کے معنے یہ ہیں کہ کسی شے کا علم دوسری خارجی اشیا کے امتیاز سے حاصل ہوتا ہے جو اس کی تحدید کرتی ہیں۔ نیز یہ شے ذہن کی اضافت و تعلق ہی سے معلوم ہو سکتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمیں مظاہری، محدود، اضافی اور مشروط موجودات کا علم ہو گا، لامحدود اور مطلق یا غیر مشروط ہمارے دائرۂ علم سے ماوراء غیر معلوم و ناقابلِ علم ہو گا۔ چنانچہ اسپنسر کے نزدیک ہمارا علم مادہ حرکت قوت اور شعور وغیرہ جیسے واقعات کے ماوراء نہیں پہنچ سکتا اور یہ سب کی سب ایک "ناقابلِ علم ہستیِ مطلق" کے شئون واحوال ہیں۔

قانونِ اضافیت پر تھوڑی دیر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون خود ذات مطلق کے تصور کو ضروری سمجھتا ہے، یعنی اضافی کے تصور میں مطلق کا تصور استلزامی طور پر موجود ہوتا ہے اور خود ہربرٹ اسپنسر نے اس کو تسلیم کر لیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ اگر دنیا محض ظہور ہے تو یہ ضرور کسی ہستی کا ظہور ہو گی، ظہور خود حدِ اضافی ہے جو کسی ہستی

کے وجود کو مستلزم ہے، اسپنسر کا کہنا صرف یہ تھا کہ مطلق کے محض وجود کے سوا ہمیں اس کے متعلق کسی شے کا علم نہیں، لیکن اسپنسر کی اس غلطی کو ہیگل نے پہلے ہی رفع کردیا تھا۔ چونکہ تمام محدود اشیاء و اذہان ذاتِ مطلق کے ظہور ہیں لہذا وہ ان ہی میں اور ان ہی کے ذریعے قابلِ علم ہے، اس میں شک نہیں کہ ذاتِ مطلق کی ماہیت ہمارے محدود ذہن میں پوری طرح نہیں آسکتی لیکن ہم اس کو ایک حد تک ضرور جزی طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس کی کچھ صفات سے واقف ہوسکتے ہیں لہذا لاادریت کا یہ دعویٰ کہ جس قسم کے علم کی فلسفے کو تلاش ہے وہ ناقابلِ حصول ہے۔ شک سے بڑھ کر ادعائیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے، لہذا یہ سائنس اور فلسفہ ہر دو کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو ان تھک اور دائمی تلاش کا نام ہے۔ فلسفی یا "عاشقِ حکمت" "آزار جستجو" ہی کو اپنی غایت سمجھتا ہے اور اقبال کی زبان میں کہتا ہے ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی   درماں نیافریدی آزار جستجو را

اور "در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را" کہتا ہوا "رمزِ کائنات" کا ہمیشہ جویا و متلاشی رہتا ہے!

فلسفیانہ نقطہ نظر کی ضرورت

سچ تو یہ ہے کہ آج سے دو ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے ارسطو نے اس بحث کا تصفیہ کردیا تھا کہ آیا ہم فلسفے کا مطالعہ کریں یا نہ کریں، اس نے کہا تھا کہ "ہم فلسفیانہ غور و فکر کرنا چاہیں یا نہ چاہیں، ہمیں فلسفیانہ غور و فکر کرنا تو ضرور پڑتا ہے"۔ شوپنہور نے انسان کی طبیعت کا پتہ لگا کر اسی لیے کہا تھا کہ انسان "مابعد الطبیعیاتی حیوان ہے"، اڈون والس نے نہایت عقلمندی سے کہا تھا کہ "ہر شخص خواہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر فرد و کائنات کے رشتہ باہمی کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور قائم کرلیتا ہے اور اسی پر

اس کی ساری زندگی و عمل کا انحصار ہوتا ہے"۔ اسی خیال کو پاولسن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہر شخص کا فلسفہ ہوتا ہے عہد فطرت میں بسنے والے وحشی کا بھی فلسفہ ہوتا ہے اور یہی اس کے اعمال و کردار کا مرکز ہوتا ہے! اور اسی معنے کے لحاظ سے جسٹرٹن کہتا ہے کہ "آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے" —یعنی اس کا فلسفہ!

آپ نے اوپر دیکھا تھا کہ فلسفی کائنات کی ماہیت و غایت کے متعلق ایک نظریہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کو چند ایسے مفروضات تسلیم کرنا پڑتے ہیں جن کی تصدیق بالکلیہ تجربہ و مشاہدہ و اختیار سے نہیں ہو سکتی۔ حواس جن چیزوں کی شہادت دیتے ہیں ان کی تکمیل وہ تخیل یا وجدان سے کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مرضی یا ارادے ہی سے ایسا کرے بلکہ بقول ارسطو خواہ مخواہ اس کو کرنا ہی پڑتا ہے، وہ کامت کی طرح اپنے کو "ایجابی کہہ سکتا ہے اور احتجاج کر سکتا ہے کہ وہ صرف واقعات ہی کی حد تک محدود رہنا چاہتا ہے، یا اسپنسر کی طرح وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ "لاادری" ہے اور اشیا کماہی کے علم سے ناواقف، لیکن وہ ان احتجاجات کے باوجود چند مفروضات کو تسلیم کرتا ہے اور خواہ مخواہ فلسفی ضرور ہے، وانّ ھٰذا لشیٔ عجاب! بڑے سے بڑا لاادری، بڑے سے بڑا شکی، یا ارتیابی، اپنے عقائد و افکار مخفی نہیں رکھ سکتا، اس کو زندگی کے کارزار میں جانب داری کرنی پڑتی ہے۔ باوجود ایجابیت و لاادریت کی لن ترانیوں کے باوجود ماورائی شان سے اس امر کا یقین دلانے کے کہ حقیقت ناقابلِ علم ہے اس کو زندگی اس طرح بسر کرنی پڑتی ہے گویا کہ اُس نے ان خوفناک استبعادات کے ایک نہ ایک پہلو کو قبول کر لیا ہے جن پر فلسفہ مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا پڑتا ہے کہ آیا یہ زمین جس پر اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے ایک ذی غایت عقل کی صنعت گری کا نتیجہ ہے یا ذرات یا سالمات کی کورانہ کشمکش کا آفریدہ، یعنی خدا کے متعلق اس کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہونا چاہیے، خواہ یہ خدا

کے وجود کے انکار ہی کی خاطر کیوں نہ ہو۔ اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ ایک خود رو مشین یا کل ہے جو دوسری مشین سے ہم صحبت ہوتا ہے تاکہ چھوٹے مشین پیدا ہوں یا ایک قوت حیات کا ظہور، تخلیقی قوت و اختیار کا حامل یا نور الٰہی کی گریز پا شعاع! اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا بھی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا عقل کی غیر یقینی قوتیں یا وجدان کی شاہانہ بداہت حقیقت کی رہنما اور صداقت کا معیار ہے۔ اسی طرح اخلاقی اقدار کے متعلق، اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وفادار رہیگا یا اپنی قوت مردانگی کو قیمۃً تقسیم کریگا! اس کو اپنے نزدیک اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا مرنے کے بعد اس کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے "خاکی است و بخاکش ہمی دہند" یا "چو دانہ خاک شگافد گل تراست" ایک اعلیٰ و ارفع زندگی میں داخل ہوتا ہے!

یہ تمام نہایت اہم مسائل ہیں اور فلسفہ موت و حیات کا معاملہ ہے اور ان تمام مسائل کے متعلق فلسفے کا کٹر سے کٹر مخالف بھی اپنے ذہن میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کر چکا ہوتا ہے، مثلاً وہ فرض کر لیتا ہے کہ مادیت صحیح ہے، حقیقت کی تمام صورتیں۔ شجر و حجر، لطف و کرم، دعا، و عبادت ــــــ سب مادی ہیں، ان کی مادی پیمائش ہو سکتی ہے۔ یہ ایک شاندار مفروضہ ہے، جس کی اختباری تصدیق بالکل ناممکن، یہی مفروضہ اس کو فلسفی بناتا ہے اور اپنے اس فلسفہ کو وہ قابلِ تعریف سادگی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ فرض کر لیتا ہے کہ دنیا ایک قسم کی میکانیت ہے، اور وہ خود ایک مشین ہے جو میکانکی اور غیر شعوری طور پر شعور کے زاید از ضرورت اور فضول ارتقا پر غور کر رہا ہے، دنیا کی تمام ہیئت کے متعلق یہ بھی ایک نظریہ ہے جواب تک ناقابلِ ثبوت ہے، اور جب اس کو دیمقراطیس یا لکریٹیس یا ہابس یا لامتری پیش کرتے ہیں تو فلسفے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ حیات میں خود اختیاری نہیں ہستی کا ہر فعل اس ابتدائی ضبابہ (Nebula)

نے متعین ذمقرر کر دیا ہے جو سائنس کی ضمنیات میں "باغ عدن" کی جگہ ہماری سامعہ نوازی کرتا ہے ۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ذہن مادہ ہے اور بقول وباستنا دنیٹشے نعوذ باللہ خدا ایک عرصہ ہوا کہ مرچکا اور اس کی متعدد قبریں مساجد و منادر میں بنائی جا چکیں !

یہ سب ممکنہ مفروضات ہیں ۔ ہر فلسفی ان کو یا ان کے مخالف مفروضات کو تسلیم کرنے کا حق رکھتا ہے ۔ ہم سب کو ان مفروضات کو تشکیل دینا اور ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ۔ زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اشیاء کی ماہیت اور انسان کی غایت کے متعلق مفروضات کو تسلیم کریں ، ہم ہمیشہ مفروضات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں ، مطلق کا "آزارِ جستجو" ہمارا "آرام جاں" ہوتا ہے ، اس کی دلکشی ہمیں ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی ہے ۔ علاوہ دوسرے وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے ، وہ دیارِ نامعلوم کا سفر ہے ، لامحدود کی تلاش میں کو بہ کو ، کوچہ بہ کوچہ سرگرداں ہونا ہے ، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی ہیں جو دل فریبی ہے اس سے زیادہ نہیں !

لہٰذا ہم سب فلسفی ہیں ، مابعد الطبیعیاتی حیوان ہیں ، ایک جو اعلاناً فلسفی ہے دوسرا جو اقراراً ایجابی ہے ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ہی اس معاملہ میں راست باز و راست گو آدمی ہے ۔

فلسفے کی ترقی پر اعتراض

فلسفے پر ایک اعتراض عام طور سے کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ مباحث میں جس دروازے سے ہم داخل ہوتے ہیں اسی دروازے سے باہر بھی ہوتے ہیں ، ہر فلسفی دوسرے فلسفی کے خیالات کا نقیض پیش کرتا ہے ، تاریخ فلسفہ ان ہی تناقضات و نظری آرا کا مجموعہ ہے جو کامیابی کے لحاظ سے مادی علوم مخصوصہ کی ترقی سے کسی

طرح مقابلہ نہیں کر سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفیانہ مباحث کے دوران میں یا تاریخ فلسفہ کے مطالعے کے وقت اگر ہم اپنا دماغ دروازے کے باہر چھوڑ کر جائیں تو بیشک اسی دروازے سے نکل آئینگے جس دروازے سے کہ ہم داخل ہوئے تھے! اکابر فلاسفہ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہزارہا اہم مسائل کے متعلق ہم اپنے خیالات بدلے بغیر رہ نہیں سکتے ہم خود فلاسفہ کے تناقضات کے متعلق بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہونگے اور پائینگے کہ بنیادی مسائل کے متعلق تقریباً تمام اکابر فلاسفہ کا اتفاق تھا، اختلافات محض اپنے اپنے زمانے کے اصطلاحات وحدود کے فرق کی وجہ سے دکھائی دیتے ہیں! اور نیز اگر ہم تاریخ سائنس کے طالب علم ہیں تو ہمیں بادی النظر ہی میں یہ معلوم ہو جائیگا کہ فلسفہ سے زیادہ سائنس میں نظریات و اعتقادات سنیما کی متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزارہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند عالمگیر اہمیت کے نظریات کا ذکر کرینگے :-

آج سے پچاس پچپن سال پہلے کائنات کے ابتدا کی توجیہ لاپلاس کے مفروضہ ضبابیہ (Nebular hypothesis) سے کی جاتی تھی۔ کانٹ فلسفی نے اس نظریے کو سب سے پہلے پیش کیا تھا، لاپلاس نے اس کی توضیح کی تھی، آج کل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چیمبرلین اور مولٹن نے اس کی توجیہ میں Planetesmal hypothesis پیش کی ہے جو اوّل الذکر نظریے کی تردید کرتی ہے۔ پچاس پچپن سال پہلے ڈارون کی Origen of Species یا اصل انواع، ارتقا کی انجیل سمجھی جاتی تھی۔ آج کل یہ دنیا بھر کے اعتراضات کا نشانہ ہے اور اس کی وقعت کا حال سب کو معلوم ہے! عمل ارتقا کی توجیہ تغیرات (Variations) کے بجائے "تحولات" (Mutations) سے ہونے لگی، اب مسٹر گیامر یر کے ساتھ ہم لامارک کے نظریے کو پھر قبول کرنے لگے

ہیں: ببیں تفاوتِ راہ! نیوٹن نے حرکت کے بعض قوانین بتائے، دنیائے سائنس نے ان کو قبول کیا، اب آئنسٹائین (Einstein) ان کی تردید کر رہا ہے۔ سے یر رم فورڈ، ڈےوی اور صدہا دیگر علمائے سائنس نے مادّے کی غیر فنا پذیری اور بقائے توانائی کو ثابت کیا اور ساڈی، ردرفورڈ، پینکارے جدید سائنس کے ان انتہائی عقائد میں شک پیدا کر رہے ہیں۔ پیرسن، ماخ وغیرہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ سائنس کا علم تخمینی احتمالات کا موجز بیان ہے، اور فطرت کے عدیم التغیر وابدی قوانین مادے کے مشاہدہ کردہ عادات کے اوسط کے سوا کچھ اور نہیں! بھلا ہم ایسی سائنس کی شان میں کیا کہیں جو فلسفے کی طرح غیر یقینی ہوگئی ہے اور فطرت کے علم کا کیا دعویٰ کریں جس کے قوانین اعداد و شمار کی سی وقعت رکھتے ہوں! کسی زمانہ میں ریاضیات کو تیقن اور غیر خطا پذیر صداقتوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا کہ ناگہاں ابعاد ثلاثہ صاحب اولاد ہوگئے جز کل کے برابر بڑا ہوگیا اور آئنسٹائین (Einstein) نے ثابت کر دیا کہ دو نقطوں کے درمیان ایک خط مستقیم بڑے سے بڑا فاصلہ ہے! فرانسس گالٹن اور کارل پیرسن کی تحقیقات کی رو سے ماحول کا اثر توارث سے زیادہ تھا مسٹر وِگم نے اس کے برخلاف بڑی شان سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھلایا کہ توارث کا اثر ماحول کے اثر سے زیادہ ہے، اب ڈاکٹر واٹسن دو سو بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہمیں اطلاع دے رہے ہیں کہ جنین اور بچے کا ماحول اس کی سیرت اور تاریخ کے تعیّن کا اہم جز ہے اور توارث کا اثر نہایت خفی ہے اور آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ آئے دن ہر ایماندار تاریخ داں ثابت کر رہا ہے کہ تاریخ جھوٹ کا دریا ہے۔[ئہ] ہر ایمان دار عالم مصریات (Egyptologist) سنین و سلسلہ ملوک کی ایک نئی فہرست پیش کرتا ہے جو دوسری فہرستوں سے چند ہی ہزار سال کا فرق رکھتی ہے!

سائنس کے نظریات کے عدیم التغیر ہونے کے ثبوت میں یہ مثالیں اہلِ بصیرت

Missisipi of Folsehoods (Voltaioe) [ئہ]

کے لیے کافی ہیں، اعمال نامے کو طول دینے کی ضرورت نہیں! فلسفی کی نظروں کے لیے تو یہ خوش کن سرکس ہے! فلسفی ہونے کی حیثیت سے ہمیں اعتراف ہے کہ فلسفہ بعض جگہ تاریک ہے لیکن یہی حال شئی کی تنظیم کا ہے، یہی حال جنسِ لطیف کا ہے، یہی حال ہر دلچسپ شے، کا ہے! اس سے بد تر ہم یہ بھی ماننے کو تیار ہیں کہ فلسفہ بعض دفعہ کذاب بھی ہے۔ ہم اپنے قلب کے عزیز تعصبات کو، بڈھی عورتوں کی دینیات کو قطعی و یقینی دلائل کے لباس میں ملبوس کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک مشہور فلسفی براڈلے نے مابعد الطبیعیات کی اس طرح تعریف کی ہے کہ "مابعد الطبیعیات (فلسفہ) ان چیزوں کے لیے جن میں ہم جبلی طور پر یقین کرتے ہیں خراب حجتوں کا دریافت کرنا ہے، لیکن ان حجتوں کا دریافت کرنا بھی کچھ کم جبلی نہیں" لیکن باوجود ان تمام نقائص و خرابیوں کے سائنس کی طرح فلسفے کی رفتارِ ترقی بھی متعین اور شاندار رہی ہے، گزشتہ پچیس سال میں فلسفے نے اسی سرعت و شان کے ساتھ ترقی ہے جس طرح کہ سائنس نے۔ ولیم جیمس جیسے محتاط و سائنٹفک فلسفی کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

"بعض حیثیتوں کے لحاظ سے تو "سائنس" نے فلسفے سے کم ترقی کی ہے۔ یعنی اس کے اکثر کلی تصورات سے نہ ارسطو کو حیرت ہوگی اور نہ ڈیکارٹ کو اگر بفرض محال انہوں نے زمین کی سیر کا پھر ارادہ کیا۔ اشیاء کا عناصر سے مرکب ہونا، ان کا ارتقا، بقائے توانائی، ایک کلی لزوم یا جبر کا تصور، یہ سب انہیں معلوم و معتاد چیزیں نظر آئینگی۔ ہاں چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً بجلی کی روشنی، ٹیلیفون اور سائنس کے دیگر جزئیات ان کو ضرور مرعوب کرینگی لیکن اگر یہ ہماری مابعد الطبیعیات کی کتابیں کھولیں یا فلسفے کے لکچر روم میں آئیں تو ہر چیز اُنہیں اجنبی سی معلوم ہوگی۔ ہمارے زمانے کا سارا "تصوری" یا "انتقادی" پہلو انہیں نیا معلوم ہوگا اور ان کے سمجھنے میں اُنہیں دیر لگیگی۔

یہ ہے فلسفی کا جواب فلسفہ کے معترضین کی خدمت میں!

عرفی گلہ سر مکن کہ جائے گلہ نیست
توفیق رفیق ہر تنگ حوصلہ نیست
ہر چاہ کے ہست یوسفے در وے ہست
صاحب نظرے لیک بہر قافلہ نیست

ہم فلسفہ کیوں پڑھیں

آخر یابد ہر کہ ز صد نقش جوید   تخمے کہ بجا افتاد آخر روید
گویند کہ ہر کہ یافت حرفے نہ زند   نے نے غلط است ہر کہ یابد گوید (شاہ بدخشی)

ہیگل کا قول ہے کہ "جس مہذب قوم کا فلسفہ نہیں ہوتا اس کی مثال ایک عبادتگاہ کی سی ہے جو ہر قسم کی زیب و زینت سے آراستہ و پیراستہ ہے لیکن جس میں 'قدس الاقداس' ہی کا وجود نہیں"۔ جس طرح ہر متمدن قوم کا ادب و فن ہوتا ہے، معاشری و مذہبی زندگی ہوتی ہے، اسی طرح اس کا فلسفہ بھی ہوتا ہے۔ مشرق میں اپنشدوں اور مغرب میں فلاطون کے زمانہ سے فلاسفہ کا یہ کام رہا ہے کہ نصب العینوں کی تشکیل کریں اور یہ تبلائیں کہ حیات انسانی کے کن تجربات کو اہم یا مرکزی قرار دیا جائے اور اس طرح قوم کی رہبری کریں۔ فلسفہ زندگیوں کو بدلتا رہا ہے، اسی معنی میں یہ تخلیقی ہے۔ "تہذیب عملی فلسفہ ہے"۔ ("A Civilization is Philosophy Concretized")

کن افادات کی بنا پر فلسفہ کو یہ رتبہ حاصل رہا ہے؟ ان ہی کی مختصر تشریح اس وقت گوش گزار کی جارہی ہے ع ہشدار کہ راہ خود بخود گم نکنی!

(۱) **فلسفہ عملی ہے:** اوّل قدم پر عام یقین کے خلاف ہم یہ تبلائینگے کہ 'فلسفہ عملی ہے'۔ نوالس نے کہا تھا کہ "فلسفہ کا کام روٹی پکانا نہیں لیکن وہ ہمیں خدا، آزادی اور حیات بعد الموت کا یقین دلاتا ہے"۔ فلسفہ آپ سے مخاطبت کرتا ہے:

یک دم غمِ جاں بخور غمِ ناں تا کے ‏ ‏ در پرورشِ ایں تنِ ناداں تا کے
اندر رہِ طبلِ شکم و نلئے گلو ‏ ‏ ایں رقصِ زنخ بضربِ دنداں تا کے (رومی)

تنِ ناداں کی پرورش میں ہمہ تن مصروف ہو کر آپ اس سے انکار کیجیے۔ شک کے جنون میں خندہ زناں پوچھیے کہ کیا واقعی فلسفہ خدا آزادی وحیات بعد الموت کا یقین دلاتا ہے؟ بس بس ۶ در خود نگر و فضولی آغاز مکن۔ کیا فخر رازی نے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ ؎

ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز ‏ ‏ معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد!

ہاں فلسفہ ہمیں ان چیزوں کا یقین عطا نہیں کرتا؛ جو چیزیں ہمیں آسانی سے ملتی ہیں ہم ان کی قدر بھی تو نہیں کرتے! فلسفہ کا کام روٹی پکانا نہیں لیکن یہ روٹی پکانے والے کی زندگی میں نئے معنی ضرور پیدا کرتا ہے اور خود روٹی پکانے کو اہمیت بخشتا ہے۔ کوتاہ و تنگ نظر افادی مقاصد، مادّی منافع، فلسفہ کے محرک ہیں اور نہ کبھی رہے ہیں۔ تاہم گلبرٹ چسٹرٹن کے اس قول میں ایک صداقت پنہاں ہے کہ "ایک لانڈ لیڈی کے لیے جو کسی کرایہ دار کو اپنے مکان میں بسانا چاہتی ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کرایہ دار کی آمدنی کیا ہے، لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ جاننا ہے کہ اس کا فلسفۂ حیات کیا ہے؟"

اگر انسان کی زندگی کے لیے صرف روٹی ہی ضروری اور کافی ہے، اگر رقصِ زنخ وضربِ دنداں ہی کو وہ مشغلۂ حیات سمجھتا ہے تو پھر وہ صاف طور پر بغیر شرم و حجاب کے کیوں نہیں پوچھتا کہ شاعری و موسیقی اور رنگا رنگ کے پھولوں کا کیا عملی فائدہ ہے؟ ان سے وہ کیوں محظوظ ہوتا ہے؟ موجودہ تمدن کی تن آسانیوں کے باوجود انسان کا ذہن حیرت ومحبت سے بتہیج ہوتا ہے اور صداقت، جمال اور خیر کا شیفتہ و فریفتہ ہے، اور یہی فلسفہ کے اقدار ہیں لیکن ذرا اس امر کی تحقیق تو کیجیے کہ ہم کسی چیز کو عملی کیوں کہتے ہیں اور کب کہتے ہیں؟ وہ کیا خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہ عملی کہلاتی ہے؟ بلاشبہ ہم عملی کے معنی کو صرف روپیہ کمانے کی قابلیت ہی کی حد تک محدود نہیں کر سکتے، گو ہمارا یہ یقین ہے کہ فلسفہ اس قابلیت

میں کسی قسم کا نقص نہیں پیدا کرتا بلکہ انسان کو ایک مرفہ الحال جماعت کا رکن بنانے میں مدد کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ کی حقیقی عملیت کے ایک اور معنی ہیں۔ فلسفہ عملی ہے اس لیے کہ وہ

(۱) تمام مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کی عادت پیدا کرتا ہے۔

(۲) تمام اشیاء، واقعات، تجربات اور اشخاص کو ان کے تمام علائق و اعتبارات میں رکھ کر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

(۳) ہمارے مقاصد و غایات، ہماری تعلیم، صنعت و حرفت، حکومت و مملکت، اخلاق و آداب و مذہب پر کامل و متوافق طور پر غور و فکر کرنے پر اُبھارتا اور آمادہ کرتا ہے۔

(۴) حیات انسانی کے معنی اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق ایک عزت بخش نظری تصور قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ زندگی پر جب بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرد کو جماعت یا معاشرہ میں ایک پاک و صاف و کارآمد زندگی بسر کرنی چاہیے۔ شہری ہونے کی حیثیت سے وہ محض روپیہ کمانے کی مشین نہیں بلکہ وہ ایک شوہر بھی ہے اور باپ بھی، وہ ایک ہمسایہ ہے جو نظم و قانون، صحت عامہ، مکانات کے حسن و آسائش اور نئی پود کی صحت اخلاقی سے گہری عملی دلچسپی رکھتا ہے۔ ان چیزوں سے عقلی دلچسپی رکھنا زندگی پر من حیث کل نظر ڈالنا ہے، اور یہی فلسفہ ہے۔ سقراط نے ہمیں تنبیہ کی تھی کہ "جس زندگی کا نظر غائر سے امتحان نہ کیا گیا ہو وہ زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں"۔

اب انسان ہونے کے معنی عملی ہونے کے ہیں اور عملی ہونے کے معنی زندگی کی غایات و اقدار اور ان کے حصول کے ذرائع پر غور و فکر کرنے کے ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کا مشہور فلسفی شلر کہتا ہے کہ "یہ نہایت جرأت کے ساتھ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تہییج فکری اپنی بدایت و ماہیت کے لحاظ سے بالکلیہ عملی ہے۔ فلسفہ کے انتہائی مسائل وہی ہیں جو زندگی کے عملی مسائل کے نتائج تک پہنچنے سے حاصل

ہوتے ہیں: ان کا تعلق اس نظریہ سے ہے جس کی توثیق ہر عمل کو کرنی چاہیے"

(۲) فلسفے کے مختلف شعبے خود مفید ہیں :-

فلسفے کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالو تو تمہیں خود ان مسائل واغراض کے مفید ہونے کا یقین ہو جائیگا۔

مثلاً منطق استدلال کے اصول سے بحث کرتی ہے۔ وہ صحیح استنباط کے شرائط کا مطالعہ کرتی ہے۔ کیا ہم سب فکر و استدلال کے معاملہ میں غیر محتاط و متناقص واقع نہیں ہوئے ہیں؟ کیا ہمیں کسی دائرہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے یا کسی معاملہ میں عملی طور پر کامیاب ہونے کے لیے تفکر و استدلال میں متوافق ہونے کی ضرورت نہیں؟ ان مسائل سے کوئی دوسرا مضمون بحث نہیں کرتا۔

اخلاقیات حیات اخلاقی کے اصول و معیارات سے بحث کرتی ہے "مفتاحِ خزاین سعادت دنیوی" پیش کرتی ہے، راہ عمل سجھاتی ہے، نیکی کی طرف لے جاتی، آدمیت کو "لحم و شحم و پوست" پر مشتمل نہیں قرار دیتی بلکہ "رضائے دوست" اصل انسانیت قرار دیتی ہے۔ دیکھو اس رباعی میں اخلاق کے کیا گر بیان ہوئے ہیں:-

بانفس جہاد کن شجاعت این است　　　برخویش امیر شو امارت این است
انگشت بہ حرف عیبِ مردم مگذار　　　مفتاحِ خزائنِ سعادت این است

کیا یہ انسان کو حقیقی معنی میں عملی اور کامیاب بنانے کے لیے کافی نہیں اور کیا ان کی ہر فرد بشر کو ضرورت نہیں؟

فلسفۂ معاشرۃ حیات انسانی کے ان غایات و اقدار سے بحث کرتا ہے جن کا تحقق حیات معاشری و ادارات مدنیہ میں ہوتا ہے جس کے علم کے بغیر زندگی حقیقی معنی میں کامل نہیں ہوتی۔ علمیات یا نظریۂ علم فکر کے شعوری و غیر شعوری مفروضات کا امتحان کرتا ہے۔ مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشیاتی و تعلیمی ادبیات پر خامہ فرسائی کرنے والے اور نیز علماء، سائنس

نہ اتنی فرصت رکھتے ہیں اور نہ انہیں اس قدر دلچسپی ہوتی ہے کہ ان تجریدی معاملات کا امتحان کریں۔ خصوصاً شاعری ایسے تصورات سے مملو ہوتی ہے جس کے تضمنات و مدلولات کا امتحان ضروری ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کائنات و زندگی کا ایک جامع نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ اور فلسفہ کے دوسرے شعبے ان سوالات کی تحقیق کرتے ہیں جن کے اٹھانے پر عقلِ انسان مجبول و مجبور ہے۔ تہذیب کی ساری تاریخ میں، قدیم اہلِ یونان سے لے کر ہمارے زمانہ تک، انسان نے ان مسائل کی تحقیق میں بے اندازہ سرور حاصل کیا ہے اور اس تحقیق سے جو بصیرت حاصل ہوئی ہے وہ اس کی آرامِ جاں، ثابت ہوئی ہے۔ اس کی دلکشی ہمیں ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی رہی ہے، فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دلفریبی ہے اس سے زیادہ نہیں!

(۳) فلسفہ علم کو جامعیت بخشتا ہے۔

فلسفہ علم میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ حیاتِ فکری میں وحدت پائی جاتی ہے، لہٰذا علم میں بھی وحدت ضروری ہے۔ عقل نظریات میں توافق و جامعیت کی متلاشی ہوتی ہے اسی کی تشفی کرتے ہوئے فلسفہ زندگی کے تمام مخصوص اغراض میں رشتۂ وحدت کا جویا ہوتا ہے۔ سائنس (علوم Sciences) انسان و عالم کے متعلق واقعات نظریات و قوانین کا توضیحی و علی بیان پیش کرتے ہیں۔ یہ محض طریقے اور راستے تبلاتے ہیں، فلسفہ ان کے برخلاف ترکیبی و توجیہی واقع ہوا ہے، یہ زندگی کے وسیع تر غایات و مقاصد و اقدار سے بحث کرتا ہے، یہ ہمیں اقدار کی دنیا میں لیجاتا ہے۔ جب غایات و اقدار پر غور و فکر کر لیجاتی ہے، عام اصول کا استحکام ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کے ہر عملی قدم پر رہبری و ہدایت کا چراغ ضیا پاشی کے لیے ہمارے سامنے موجود رہتا ہے۔

---

(۴) فلسفہ ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ کس چیز کے متعلق سوال کریں اور سوال کس طرح کریں

بعض دفعہ فلسفہ کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ فلسفہ نہ کسی مسئلہ کو حل کرتا ہے اور نہ کسی سوال کا قطعیت کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ سائنس کے بخلاف جو ضروری اور اہم سوالات کے مخصوص جواب دیا کرتی ہے، فلسفہ محض سوالات کو اُٹھاتا ہے اور جواب کسی کا نہیں دیتا ہے

آں قوم کہ راہ بیں فنا دند شدند کس را بہ یقیں خبر ندادند شدند

آں عقدہ کہ ہیچ کس ندانست کشاد ہر یک بندے برآں نہادند شدند (طوسی)

ذرا توقف کیجیے اور ایک وقت میں ایک سوال کیجیے۔ کیا آپ کسی ایسی سائنس کا نام بتا سکتے ہیں جس نے کسی بھی اہم سوال کا یقینی و قطعی جواب دیا ہو؟ سائنس کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح سائنس میں نظریات و اعتقادات سنیما کی متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزارہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔[۱]

اسی خوش کن سرکس کو نظروں کے سامنے رکھ کر نورتھ نے کہا ہے کہ " دنیا میں کوئی شے اتنی سریع الزوال یا گریزپا نہیں جتنی کہ سائنٹفک تھیوری (حکیمانہ نظریہ) اور نہ ہی کوئی شے اتنی فرسودہ، پھپوند بھری، متعفن اور سڑی جتنی کہ پرانی سائنٹفک تھیوری۔ علماء سائنس فلسفیوں پر یہ کہہ کر طعن کرتے ہیں کہ اس پیشے کے لوگ ایک دوسرے کی تردید کرکے جیتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ طعن علماء سائنس پر بھی اتنا ہی صحیح ہے"۔ اسی لیے ان دنوں پختہ کار، بالغ نظر علماء سائنس اپنے بیان میں نہایت محتاط اور متواضع واقع ہوئے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ علوم ایجابیہ (Sciences) بھی زیادہ سوالات اٹھاتے ہیں اور بہت کم کا جواب دیتے ہیں۔ علوم ایجابیہ واقعات کو جمع کرتے ہیں اور ان پر قوانین و نظریات کو مرتب کرتے ہیں اور ان ہی اعلیٰ تعمیمات کے متعلق علماء سائنس ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ صورتِ حال وہی ہے جس کی توقع کی جانی چاہیے؛

[۱] دیکھو اوپر صفحہ ۵ و صفحہ ۵۲

چونکہ انسان کو تمام واقعات کا علم نہیں لہٰذا مسائل کے حل میں مختلف علماء مختلف مفروضات و مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اختلاف آرا، لازمی نتیجہ ہے۔ اسی معنی میں فخر رازی کے ان اشعار کو لیجیے جن میں سے ایک شعر کا اوپر بیان ہوا۔

ہرگز دلِ من ز علم محروم نشد کم ماند اسرار کہ مفہوم نشد!
ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد!

سائنس و فلسفہ دونوں کی تاریخ انسان کے علم کے ناقص و ناکامل ہونے کو بتلا رہی ہے۔ حقیقت انتہائی کے علم کے متعلق ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ

نہ عقل بہ سرحدِ کمال تو رسد نہ جاں بہ سراچۂ وصال تو رسد
گر جملۂ ذراتِ جہاں دیدہ شود ممکن نبود کہ در جمالِ تو رسد (عطار)

لیکن سائنس اور فلسفہ کے متخالف و متضاد مسلک ایک دوسری کی تکمیل کرتے ہیں اور تحقیق و تدقیق کو ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ فلسفہ بھی سائنس کی طرح انسان کے علم کی کمیت و کیفیت میں اضافہ کر رہا ہے۔ وہ انسان کی فہم کو جلابخش رہا ہے، روشن کر رہا ہے، اور دنیا کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے رہا ہے۔

فلسفہ کی ناکامیوں کو ماننے کے باوجود (جو سائنس کی ناکامیوں کی طرح قابلِ شرم ہیں!) ہم کہتے ہیں کہ فلسفہ اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرتا ہے اور اپنے طالبِ علم کو دیدۂ بینا عطا کرتا ہے۔ اگر وہ صرف یہ سکھلاتا ہے کہ عقلی طور پر کونسے سوالات کیے جاسکتے ہیں اور کونسے سوالات نہیں کیے جاسکتے۔ بقول پروفیسر کالنکس کے "اگر فلسفہ استنطاق کے سوا کچھ نہیں تو یہ کم از کم ہمارے سوالات کو مُشکّل کرتا ہے؛ ان کو ایک دوسرے سے متوافق بناتا ہے، بلفظ واحد ہم کو عقلی سوالات پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ جاننا اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی جاننا کہ ہم جانتے کیوں نہیں ایک قسم کا فائدہ ہے"۔ برٹرنڈ رسل کے اس قول میں صداقت بھری ہے کہ "دراصل فلسفہ کا فائدہ زیادہ تر اس کی حیرت و عدم یقین آور

ہی پر مشتمل ہے جس شخص کے خمیر میں فلسفہ کی آمیزش نہیں اس کی زندگی ایسے زندان میں بسر ہوتی ہے جس کی کچھ تیلیاں تو فہم عام کے تعصبات نے گڑھی ہیں، کچھ اس کے زمانہ اور قوم کے اعتیادی تیقنات نے، اور کچھ ان اذعانات نے جو اس کے ذہن میں بغیر عقل و فہم کے اشتراک و رضامندی کے پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے آدمی کے لیے دنیا محدود متعین و واضح ہو جاتی ہے، عام اشیا، اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا نہیں کرتیں اور غیر مانوس امکانات کو وہ حقارت کے ساتھ رد کر دیتا ہے" بقول براؤننگ کے اس قسم کے لوگ ان حیوانات کے مانند ہوتے ہیں جن کی محدود دنیا میں شک کی مستنیر شعاعیں اپنی تابناکیاں نہیں دکھلاتیں!" فلسفہ مانوس اشیاء کو نامانوس لباس میں پیش کر کے ہمارے احساس تحیر کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے" فلسفہ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ وہ ہمارے مفروضات و ظنیات سابقہ سے ہمیں واقف کرتا ہے اور ان پر شک کرنا سکھلاتا ہے۔ اسی معنی میں کانٹ نے کہا تھا "There is no philosophy, there is only philosophising" "فلسفہ نہیں تفلسف اصل شئے ہے!" ہمیں علم کی خواہش ہے، کامل و مکمل صداقت کے ہم جویاں ہیں لیکن سوچو تو "سعی" میں بھی اتنی ہی لذت ہے جتنی حصول میں! غالب کے دل سے اس لذت کو پوچھو جو اس کی "سعی لاحاصل" میں تھی! بو علی سینا کی طرح ہم بھی کہینگے:۔

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت   یک موئے نہ دانست ولے موئے شگافت
اندر دل من ہزار خورشید بتافت   و آخر بکمال ذرہ راہ نیافت

فلسفہ گو "کمالِ ذرہ" تک پہنچ نہ سکا (اور سائنس کب ذرہ کی ماہیت سے واقف ہے) لیکن دل تو تفلسف و تفکر کی وجہ سے ہزار خورشید تاباں کی طرح چمک اٹھا!

(۵) فلسفہ فرد کو کائنات میں اپنی جگہ پہچاننے میں مدد دیتا ہے:۔

فرد کا فطرت میں کیا مقام ہے؟ میں کون ہوں ؟ سرگشتہ بہ عالم زپے چیستیم ؟
انسان حیوانات سے بھی وابستہ ہے اور اپنی عقل و فکر کی وجہ سے ان سے ممیز بھی۔ کیا ہی تعجب کی بات ہے کہ وہ دوسرے حیوانات کی طرح قوانین جبر کے ماتحت بھی ہے اور صداقت، حسن و خیر کا جویا و متلاشی بھی۔ سوائے فلسفہ کے ان عمیق مسائل پر کوئی علم روشنی نہیں ڈالتا۔

طبیعی علوم دوربین اور خوردبین کی مدد سے مکان کے حدود کو پیچھے ہٹاتے جارہے ہیں اور نئے عوالم کا انکشاف کر رہے ہیں۔ جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ہمارا یہ سیارہ (زمین) جس پر ہماری بود و باش ہے اپنے آفتاب سمیت جو ایک قریب الموت ستارہ ہے، کروڑہا ستاروں، آفتابوں اور سیاروں میں ایک ناچیز ذرہ خاک ہے، تو انسان کے قد و قامت کے ڈیڑھ دو گز کتنے حقیر معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے برخلاف جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی مخلوق قوت فکر رکھتی ہے احساس و تخیل کی قابلیت رکھتی ہے اور ان کی مدد سے اجرام سماوی کی عظیم الشان ترتیب پر غور کرتی ہے اور زمین کے نباتی و حیوانی عجائب پر سر دھنتی ہے تو پھر انسان کی عظمت و وقعت مبرہن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پیاسکل نے کہا تھا "انسان محض ایک نے کے مانند ہے، فطرت کی کمزور ترین نے، لیکن وہ فکر کرنے والی، سوچ بچار کرنے والی نے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ساری کائنات اس کو کچلنے کے لیے ہتھیار بند ہو جائے، ہوا کا ایک جھونکا، پانی کا ایک قطرہ اس کے مارنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر کائنات انسان کو کچل بھی ڈالے تب بھی انسان اپنے مارنے والے سے زیادہ شریف ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ مر رہا ہے اور کائنات کو اس برتری کا کوئی علم نہیں جو اس کو انسان پر حاصل ہے"۔ اس طرح کائنات میں اپنی حیثیت و منزلت سے واقف ہونا نفس کو قوی بناتا ہے، انسان کی زندگی کو گراں قدر و باوقعت قرار دیتا ہے۔ مشاہدہ و قوتِ فکر کی وجہ سے انسان گو جزی

طریقہ ہی سے سہی یہ سمجھتا ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات ایک نظام رکھتی ہے، قانون و ہم آہنگی کی اس پر حکومت ہے اور انسان اس کا ذی علم ناظر ہے!

علاوہ ازیں فلسفہ انسان کو اس پیچیدہ و مرکب نظام معاشرت میں اپنی جگہ کے پہچاننے میں مدد دیتا ہے۔ خود معاشرت کی ترکیب کئی متداخل اداروں سے ہوئی ہے جن میں ہم خاندان، حکومت، مذہبی محکموں، اور صناعی اداروں کا ذکر کر سکتے ہیں۔ فرد کو موجودہ زمانہ کی اس پیچیدہ معاشرت میں حصہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نظام معاشرت من حیث الکل کا ایک صاف واضح اور اجاگر تصور ذہن میں رکھے اور متقابلہ معاشری اقدار سے واقف ہو۔ فلسفۂ معاشرت اس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ فرد کو ایک اچھے شہری بننے کے قابل بناتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم تحقق ذات کو بلند ترین اخلاقی غایت قرار دیں جو دوسرے نفوس کے باہمی اشتراک کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس غایت کے حصول کے لیے دنیا اور زندگی کا ایک جامع اور مستوعب علم ضرور قرار پاتا ہے۔ انسان کی برترین مسرت اور اس کی ترقی و تکمیل ان اشیاء، واقعات واعمال کے جاننے اور ان کی قدر کرنے پر منحصر ہوتی ہے جن کے درمیان اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اس کی ذات، فکر، احساس و عمل، اس کے وجود کی ساری قدر و اہمیت، اپنا سارا مواد یہیں سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کی اخلاقی، مذہبی اور جمالیاتی فطرت کا کمال و تحقق خارجی دنیا ہی کی مخالطت و مصاحبت سے ممکن ہے۔ انسان جس قدر زیادہ اپنی ذات سے واقف ہوتا جا رہا ہے، اسی قدر زیادہ اس کو صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی ذات کا تحقق فطرت و معاشرت کے ساتھ ارتباط و اتصال ہی سے ممکن ہے۔ انسان کی زندگی خلا میں نشو و نما نہیں پا سکتی۔ فلسفہ نہ صرف تحقق ذات کے معنی کی توضیح و تعریف کرتا ہے بلکہ اس کے حصول کے طریقے بھی بتلاتا ہے۔

فلسفہ اپنے طالب علم کا تعارف بنی نوعِ انسان کے عظیم الشان مفکرین اور

ذہنی قائدین سے کراتا ہے۔ ان تخلیقی ذہنوں کی صحبت سے زیادہ شخصیت انسانی کو مالا مال بنانے میں کوئی شئے موثر نہیں۔ فلاطون نے کہا تھا کہ "دنیا میں چند ایسے حکیم موجود ہیں جن کی صحبت بے بہا ہے" مولانائے روم فرماتے ہیں ؎

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی   یا در رہ دیں صاحب دردے گردی
ایں را بجز از صحبتِ مرداں مطلب   مردے گردی چو گردِ مردے گردی

فلسفہ انسان کو اس مجلس میں پہنچاتا ہے جہاں سقراط و افلاطون، ارسطو و ایپکیورس فلاطینوس وسینٹ اگسٹائن، ٹامس اکوئناس، ابن سینا، غزالی، ابن رشد، ڈیکارٹ واسپنوزا، بارکلے، ہیوم، کانٹ و ہیگل، اسپنسر و ولیم جیمس، شلی و کیٹس اور گوئٹے، بلخ و اگز خنداں پیشانی کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں، اور ہم جب تک سننے پر راضی ہوں ہم سے گفتگو کرنے پر آمادہ ہیں۔ خدائے لایزال کے اس شہر میں جہاں یہ مجلس آراستہ ہے لا متناہی خزائن ہمارے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ ہمیں صرف آگے بڑھ کر ان سے مالا مال ہونا ہے!

(۶) فلسفہ ہمیں جمالیاتی لذت بخشتا ہے۔

فلسفہ ایک نہایت اہم معنی میں اپنی غایت آپ ہے۔ لذتِ جمال کی طرح فلسفیانہ غور و فکر اپنی آپ منزل ہے۔ فلسفہ کی نظری قیمت کے لیے حجت و استدلال پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ ثابت کرنا کہ انسان کو حصولِ صحت کی کوشش کرنی چاہیے، دوستی و محبت قائم کرنی چاہیے، سیرت اخلاقی کی تکمیل کرنی چاہیے، شعر پڑھنا اور موسیقی سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ جو لوگ ان تجربات و اقدار سے واقف نہ ہوں وہ حجت سے قائل نہیں ہو سکتے۔ ان کی اصلی قیمت شخصی و باطنی ہوتی ہے، ان کی قدر و قیمت کا احساس دوسروں میں پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ افلاطون کسی جگہ خیر و صواب کے افادی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ جن لوگوں میں

یہ صفات موجود ہیں "ان کی ہستی زیادہ حقیقی ہوتی ہے"۔ ارسطو شہریت اور دنیوی معاملات میں حصہ لیکر ذات کی تکمیل وتحقیق کے جذبہ کو سراہتا ہے، لیکن ایک صحیح معنی میں تعلیم یافتہ شخص کی فکری زندگی کو حیات کی اعلیٰ ترین غایت قرار دیتا ہے۔ اسپنوزا کو "خدا کی عقلی محبت" میں اور صوفی کو صداقت، خیر وجمال کی وحدت کی بصیرت سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ کس طرح ظاہر کی جا سکتی ہے؟ برٹرنڈ رسل جب دنیائے معاشرت کے اختلال واضطراب، شر وفساد سے ہٹ کر ریاضیات ومنطق کے دائمی حقائق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو جو سکون، راحت وطمانیت حاصل ہوتی ہے وہ صوفی کے غایتِ سرور وفرطِ حظ سے زیادہ مختلف نہیں۔

(۷) فلسفہ ہماری سیرت وشخصیت کو قوی کرتا ہے:۔

فلسفہ ہمیں وحدت ذہنی عطا کرتا ہے۔ آپ ہم سب فکر کے عمل میں غیر محتاط اور متناقض ہوتے ہیں، ہمیں بڑی حد تک توافق وتطابق کی ضرورت ہے۔ فلسفیانہ تعلیم ہمیں فکری وحدت بخشتی ہے، اس وحدت ذہن یا وحدت فکر سے ہماری خواہشوں میں وحدت پیدا ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے سیرت میں وحدت پیدا ہوتی ہے، جو شخصیت کا دوسرا نام ہے، اور سیرت کی وحدت کی وجہ سے زندگی میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو مسرت کا راز ہے اور جو ہم میں سے سب کی غایت قصوٰی ہے۔ خوش باشوں کے شہنشاہ ایپکیورس نے دو ہزار سال قبل اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا، جس میں وہ کہتا ہے:۔

"کسی شخص کو جب تک وہ جوان ہے فلسفیانہ تعلیم حاصل کرنے میں دیری نہ کرنی چاہیے۔ اور اگر وہ ضعیف ہے تو اس کو اس تعلیم کے حصول میں تھکن نہ ظاہر کرنی چاہیے، کیونکہ وہ کون شخص ہے جو اپنی روح کی صحت کے علم کو حاصل کرنے میں وقت کی موزونیت "ناموزونیت" اور تاخیر کا خیال کریگا؟ اور جو شخص یہ کہتا ہو کہ فلسفہ سیکھنے کا ابھی وقت نہیں آیا یا وہ وقت

گزر چکا تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو یہ کہتا ہو کہ ابھی مسرت کا وقت نہیں آیا یا وہ گزر گیا"۔[1]

فلسفیانہ تعلیم سے انسان اپنے جذبات کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے، جذبات کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے دوسروں کی غلامی سے نجات پاتا ہے، اپنی ذات کے شریف تر جوہر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

در بسترِ آرزو غنودن تا کے — تا کے مرہونِ نفس بودن تا کے
یکبار بسہو ہم سرے بالا کن — بر درگہ خلق جبہ سودن تا کے

(شعر در امتحان)

روما کے ایک جادو بیان کے الفاظ میں ہم فلسفہ کو مخاطب کر کے کہہ سکتے ہیں:

"اے فلسفہ کی روح، اے ہماری زندگی کی رہنما، نیکی کی دوست اور بدی کی دشمن تیرے بغیر ہم کیا اور ہماری زندگی کیا!" (سسرو)

---

[1] دیکھو ایم، بکیول کی کتاب Source Book in Ancient Philosophy ص ۲۶۹ (چارلس اسکر نبرس سنس، ۱۹۰۷ء)

فلسفہ کی دُشواریاں

اسرارِ وجود خام و آشفتہ بماند   واں گوہرِ بس شریف ناسفتہ بماند
ہر کس زسرِ قیاس حرفے گفتند   واں نکتہ کہ اصل بود ناگفتہ بماند
(بو علی سینا)

فلسفہ اپنے بیشمار فوائد اور خوبیوں کے باوجود مشکل ضرور ہے، باوجود اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے فلسفہ کا مطالعہ آسان نہیں۔ مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی میں کوئی قیمتی شے بے کاوش جان نہیں ملتی، ”بے خون پیے لقمہ تر کسی کو نہیں ملتا“ اور ”بے خاک چھانے زر کسی کو نہیں حاصل ہوتا!“ فلسفہ کی ان ہی بعض مشکلات کا یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ ع یک تنقیۂ دماغ می باید کرد!

(۱) فلسفے کی اصطلاحات دقیق ہوتی ہیں:۔ فلسفہ، بلکہ ہر سائنس کی اپنی مخصوص زبان اور اپنی مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ کسی مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ہر طالب علم کو اس مضمون کی اصطلاحوں سے اچھی خاصی کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ فلسفے کی اصطلاحیں دقیق ضرور ہیں، لیکن کس سائنس کی مصطلحات دقیق نہیں؟ فلسفے کو اعلیٰ و لطیف افکار کی ترجمانی کے لیے مخصوص متعین زبان کا استعمال کرنا پڑتا ہے، اور یہ زبان سوداسلف، لین دین کی زبان تو ہو نہیں سکتی، لازماً علمی و اصطلاحی زبان ہوگی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض دفعہ یہ غیر ضروری طور پر گراں و ثقیل ہوتی ہے، جیسے فلاطینوس، کانٹ، نطشے، اور ہیگل کی تصانیف سخت عسیر الفہم زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے برخلاف فلاطون، شوپنہور، بارکلے، ہیوم، جان اسٹوارٹ مل، ہنری برگسان، ولیم جیمس

برٹرنڈرسل، جارج سنٹیانا کی تصنیفات صاف شفاف اور خوشگوار ہیں۔

اصطلاحات کے بارے میں فلسفیوں کی بعض اور خصوصیات کی وجہ سے طلبہ کو فلسفے کے سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے[1]۔ فلسفی روزمرہ کے الفاظ کو خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ طالب علم توان الفاظ کے وہی معنی لیتا ہے جو اس نے روزمرہ کے استعمال میں سیکھے ہیں اور اس طرح وہ فلسفی کے حقیقی معنی و مفہوم کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ مثلاً پروفیسر وایٹ ہڈ جو زمانہ موجودہ کا ایک مشہور فلسفی ہے، اپنی تصانیف میں "حادثہ" Event کا لفظ استعمال کرتا ہے جو اس کے فلسفے کا سنگ زادیہ ہے اور جس کے معنی نہایت اصطلاحی ہیں۔ اس میں شک ہے کہ فلسفہ کے بعض اساتذہ نے بھی صاف طور پر سمجھا ہے کہ وایٹ ہڈ کی اس سادہ لفظ سے کیا مراد ہے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بھی شک کرنے کی گنجائش ہے کہ خود وائٹ ہڈ بھی جانتا ہے کہ درحقیقت اس لفظ سے وہ کیا تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ خود اس کا فلسفہ ابھی خام حالت میں ہے اور جوں جوں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا جا رہا ہے ڈاکٹر وائٹ ہڈ "حادثہ" کے لفظ کے مفہوم کو بدلتے جا رہے ہیں۔ اب اگر طالب علم "حادثہ" کے عام معنی لے تو وہ اس فلسفی کی بحث کو کیا خاک سمجھ سکتا ہے؟ اسی طرح ہم بیشمار مثالیں ہم عصر مصنفین و عہد ماضی کے اکابر فلاسفہ کی تصانیف سے پیش کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے فلسفہ کے طالب علم کا ایک اہم مسئلہ یہ دریافت کرنا ہوتا ہے کہ فلسفی نے معمولی الفاظ کو کن اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے فلسفی کسی ایک مخصوص لفظ کو دوسرے سلسلہ میں خاص معنی

---

[1] ڈی ایس مانیین نے اپنی کتاب *An Introduction to Living Philosophy* صفحہ ۳۰ تا ۳۱ میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ جو راقم الحروف نے کیا ہے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں "مقدمہ فلسفہ حاضرہ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

پہنائیں جو کسی اور فلسفی کے استعمال سے بالکل مختلف ہوں۔ فلسفہ کا ہر مسلک ایسی مخصوص اصطلاحی لغات کا استعمال کرتا ہے جن کو دوسرے مسلک کے فلاسفہ اختیار نہیں کرتے الا اس صورت کے جب ان کو مخالفین کی آرا، کا ذکر کرنا پڑے۔ اسی ایک واقعہ نے بہتوں کو فلسفہ سے تنفر کر دیا ہے اور وہ اس کو محض لفاظی اور تجریدات کا گورکھ دھندہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن سوچو تو یہ حکم ان کی زود رنجی بلکہ بزدلی پر دلالت کرتا ہے اور فلسفہ کا اس میں زیادہ قصور نظر نہیں آتا جیسا کہ آپ خود فلسفہ کے موضوع بحث کی اہمیت سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فلسفہ بازاری زبان تو استعمال نہیں کر سکتا، اور جب تک معمولی الفاظ میں نئے معنی نہ پیدا کرے وہ اپنے عمیق افکار کو ادا نہیں کر سکتا۔ زبان کا دامن اس قدر تنگ ہے!

(۲) فلسفیانہ غور و فکر کے لیے علم کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ضروری ہوتا ہے:۔ یہ بالکل صحیح ہے (جیسا کہ ہم بتا آئے ہیں) کہ ہر شخص کا کچھ نہ کچھ فلسفہ ضرور ہوتا ہے۔ خواہی نخواہی وہ فلسفیانہ غور و فکر کرتا ہے۔ ہر شخص نے اپنی زندگی میں فلسفیانہ استعجاب کے ساتھ ضرور پوچھا ہوگا کہ ؂

"معلوم نشد کہ در طربخانۂ خاک　　نقاشِ من از بہر چہ آراست مرا؟"

اور شاید اس کے جواب دینے کی بھی کوشش کی ہو۔ اس کوشش میں جس مواد کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس نے استعمال کیا ہوگا وہ وہی ہوگا جو اس کے سماجی و مادی ماحول سے حاصل ہوا ہے۔ کائنات اور حیات کی ماہیت و غایت کے متعلق کسی نقطۂ نظر کے اختیار کرنے کے لیے انسان کو ابتداء تو وہیں سے کرنی پڑتی ہے جہاں وہ ہے اور اسی مواد کو کام میں لانا پڑتا ہے جو وہ رکھتا ہے، تاہم ایک لمحہ غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام افراد انسانی میں سے فلسفی ہی وہ فردِ بشر ہے جس کو سب سے زیادہ واقفیت و معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، بالفاظ مختصر وہی اس علم کا زیادہ حاجتمند ہوتا ہے جس کی علوم

مخصوصہ میں تنظیم کی گئی ہے، تاکہ وہ اس کی مدد سے اس راز کو کھولے جس کے متعلق بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ؎ کھلتا نہیں کھُل کر بھی عجب راز ہے یہ! اگر بفرضِ محال وہ تمام علوم مخصوصہ کے طریقوں اور ان کے مسلمات و مفروضات و نتائج سے آگاہ ہو سکے اور نیز مذہب اخلاق اور فنون لطیفہ کا بھی نکتہ رس طالب علم ہو سکے تو اس کو ضرور ہونا چاہیے۔ کیوں؟ اِسی لیے کہ فلسفی ان حقائق سے بحث کرتا ہے جو اساسی ہیں اور اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اقدار و معانی کی بصیرت رکھتا ہو، اور اسی لیے اس کا علم نہایت مفصل اور جامع ہونا چاہیے۔ اسی لیے فلسفہ مشکل ہے، آسان نہیں۔ کائنات کی گتھی کے سلجھانے کی کوشش جواں مردوں کا کام ہے، بچوں کا نہیں، پیران نابالغ کا نہیں کیونکہ ؎

اس دشت میں سینکڑوں کے جی چھوٹ گئے   پتھر بھی حباب کی طرح پھوٹ گئے!

فلسفہ کے لیے نہ صرف علم کا عظیم الشان ذخیرہ ضروری ہے بلکہ ہر قسم کے تعصب جانبداری، پیچ سے بھی ذہن کا آزاد کرنا لازمی ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اسپنوزا نے اپنے تفلسف کا نصب العین یہ قرار دے رکھا تھا کہ کائنات کا "ابدیت کی روشنی" میں مطالعہ کیا جائے۔ اس کے لیے فلسفی کو نہ صرف اپنی تنگیٔ نگاہ کو دور کرنا پڑتا ہے بلکہ کشمکشِ ہوا و ہوس سے بھی نجات حاصل کرنی پڑتی ہے، کیونکہ بندۂ ہوس اسیر قفس ہوتا ہے اور صداقت سے محروم۔ فلسفی صداقت کا جویا ہوتا ہے اور صداقت ہی کی خاطر صداقت کی تلاش کرتا ہے نہ کہ کسی ذاتی غرض یا دلچسپی کی خاطر۔ اس کا نقطۂ نظر بالکل معروضی و خارجی ہونا چاہیے۔ یہی چیز فلسفہ کو ایک نہایت مشکل علم قرار دیتی ہے۔

(۳) فلسفہ کے مطالعہ کے لیے بڑی جسارت کی ضرورت معلوم ہوتی ہے: اگر عالم حیاتیات حیات کی بیشمار لطیف فعلیتوں کی سُراغ رسانی میں اپنے عجز کا

احساس کرتا ہے، اور اگر عالم ہیئت اپنی دوربینوں سے لامتناہی فضا میں ان گنت ستاروں کو دیکھ کر، جو کروڑہا سال کے فاصلہ پر محوِ خرام ہیں، اپنی بے بساطی پر خجل ہوتا ہے، اور اگر علماء طبعیات و کیمیا و نفسیات و اجتماعیات مظاہر کے ربط و ضبط کے قوانین کی دریافت میں حیران و سرگرداں نظر آتے ہیں، تو پھر فلسفی جس کا عظیم الشان کام ان علوم مخصوصہ کے مفروضات و نتائج کو یکجا کرنا اور کائنات من حیث کل کے متعلق ایک خاص نتیجہ تک پہنچنا ہے، کیوں نہ لاف و گزاف کو ترک کر کے سرِ عجز خم کرے! فلسفی کے موضوعِ بحث کی اسی وسعت کو دیکھ کر بارہا مختلف پیرایوں میں یہ خیال ادا کیا گیا ہے ؎

کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد　　　　دز سرِ خدا ہیچ کس آگاہ نشد
ہر کس ز سر قیاس چیزے گفتند　　　　معلوم نہ گشت و قصّہ کوتاہ نشد (خیام)

اگر فلسفہ ایک لازمی و ناگزیر شئے نہ ہوتا تو غریب فلسفی کی حیثیت مضحکہ انگیز ہوتی لیکن ہم بتا چکے ہیں کہ بقول ارسطو ہم "فلسفیانہ غور و فکر کرنا چاہیں یا نہ کرنا چاہیں لیکن کرنا تو ضرور پڑتا ہے"۔ انسان کو خواہی نخواہی فلسفہ کی ضرورت پڑتی ہے، عملی زندگی کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ماہیت اشیاء و غایت و بدایت انسانی کے متعلق مفروضات کو تشکیل دیں اور اُن کو تسلیم کریں۔ اس معنی میں ہر شخص کا کچھ نہ کچھ فلسفہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ چاہے تو اپنے اس اہم فریضہ کو ہاتھ میں لینے سے پہلے جس قدر ذخیرۂ علم ممکن ہو سکے فراہم کر سکتا ہے۔ چونکہ تہذیب و تمدن کی مشعل بغیر فلسفہ کے روشن نہیں رہ سکتی اسی لیے فلسفہ کا وجود ضروری ہے گو ہم اپنی "عقل ناصواب" کی شکایت سے دفتر سیاہ کیوں نہ کرتے رہیں۔

(۴) فلسفہ اور فلسفیوں کی جو تحقیر کی جاتی ہے وہ ہمیں فلسفہ کے مطالعہ کی طرف سے پست ہمت کرتی ہے :-

فلسفہ اور فلسفے کے حامی اکثر اعتراضات کا نشانہ بنتے رہے ہیں، یہ اعتراضات نہ صرف ان دونوں کا مضحکہ اُڑاتے رہے ہیں بلکہ ان کی سخت تحقیر بھی کرتے آئے ہیں۔ استہزار و حقارت اس حد تک ضرور حق بجانب ہیں جس حد تک کہ فلسفہ محض ان اثیری تخیلات کی تعبیر ہے جو منت کشِ معنی نہیں، اور یقیناً فلسفہ بعض دفعہ محض بال کی کھال ہی کھینچا کیا ہے، اور بے معنی مسائل میں اپنا وقت رائیگاں کیا ہے لیکن کونسا علم ایسا ہے جس میں اس قسم کی "فضولی" نہ ہوئی ہو؟ فلسفہ کی مخالفت کی زیادہ تر وجہ یہ رہی ہے کہ اکثر فلسفیانہ مسائل جو عالم حواس کے مادی سوالات سے ماوراء ہوتے ہیں اور جن سے کسی قدر اصطلاحی زبان میں بحث کی جاتی ہے عوام کے لیے عسیر الفہم ثابت ہوئے ہیں۔ عوام جس چیز کو سمجھ نہیں سکتے اس کو بے معنی قرار دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب فلسفہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ محض "تخیلات کا جولانگاہ" ہے؛ یا یہ عمومی و کلی اشیار کے متعلق ہذیان و خرافات کے سوا کچھ نہیں؛ یا بقول میورہڈ "یہ ایسی چیز کا، جو ہر شخص جانتا ہے، ایسی زبان میں بیان کرنا ہے جس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا"؛ یا برخلاف علوم مخصوصہ کے جو ہمیں معلومات کا ذخیرہ عطا کرتے ہیں، فلسفہ صرف ماضی پر نگاہ ڈالتا ہے اور انسان کو ترقی کی راہ نہیں سجھاتا، یا یہ کہ فلسفہ "کیمیائے اوہام" کے سوا کچھ نہیں ـــــ جب ہم فلسفہ کے متعلق اس قسم کی مزخرفات سنتے ہیں تو ہمیں فوراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے قائل نہ تاریخ فلسفہ ہی سے واقف ہیں اور نہ فلسفہ کی موجودہ حیثیت سے!

غریب فلسفی پر جو پھبتیاں کسی گئی ہیں وہ اور زیادہ دلچسپ ہیں۔ ارسٹوفینس (پانچویں صدی قبل مسیح) فلسفہ کا مضحکہ اڑاتے ہوئے سقراط کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اپنا دامن بادلوں میں گھسیٹتا چلتا ہے اور اس کی زبان سے وہ بکواس جاری ہوتی ہے جس کو "فلسفہ" سمجھا جاتا ہے! گوای زاآلکاٹ کے ذہن میں بھی اسی قسم کا فلسفہ تھا جب

اس نے فلسفی کی تعریف اس طرح کی کہ فلسفی وہ شخص ہے جو ایک غبارے میں بیٹھا اوپر پرواز کر رہا ہے، اور اس کا خاندان اور احباب رسّی پکڑے ہوئے ہیں اور اس کو نیچے کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں! گوئٹے، فاؤسٹ میں میفسٹوفلیس کی زبانی کہلواتا ہے: مفکّر کی مثال اس جانور کی سی ہے جس کو شیطان ایک برف زدہ مقام پر گھما رہا ہے گو اس کے اطراف میں سرسبز و شاداب چراگاہ بھی موجود ہے!"۔ ملٹن فلسفہ کو دوزخیوں کا ایک مشغلہ قرار دیتا ہے۔ وہ دوزخ میں شیاطین کی مختلف مصروفیتوں کا ذکر کر رہا ہے جو اپنے عذاب کے کم کرنے کے لیے فلسفیانہ غور و فکر میں حیران و سرگرداں ہیں :-

"شیاطین ایک تنہا پہاڑی پر اپنے اعلیٰ خیالات میں منہمک ہیں، اور خدا، علم غیب، ارادے قسمت یا تقدیر پر بحث کر رہے ہیں۔ مقدّر، آزادیٔ ارادہ، علم غیب مطلق پر غور و فکر ہو رہا ہے، لیکن ان کی بحث کا کوئی انجام نہیں، وہ ورطۂ حیرت میں گم ہیں۔ خیر و شر، سعادت والم، جذبہ و عدم رغبت، خوش بختی و بدبختی پر بحث جاری ہے؛ لیکن یہ ساری بیہودہ خیال بازی و رائے زنی ہے، باطل فلسفہ ہے!"

جامیؔ فلسفہ کو "سخن طرازی" "افسوں گری" "فسانہ سازی" اور "خیال بازی" قرار دیتے ہوئے فلسفی کو "سادہ دل" یا بیوقوف کہتے ہیں :-

جامیؔ تن زن سخن طرازی تا چند   افسوں گری و فسانہ سازی تا چند
اظہارِ حقائق بہ سخن ہست محال   اے سادہ دل این خیال بازی تا چند

جن فلاسفہ کا یہ خیال ہے کہ انھیں صداقت کا پتہ لگ گیا ہے ان کی مثال ان اندھوں سے دی جاتی ہے جو خواب میں اپنے کو بینا دیکھتے ہیں ؎

کوراں خود را بہ خواب بینا بینند!

اس بیہودگی اور حماقت کا ذکر کرتے ہوئے جس میں تمام حیوانات میں سے صرف انسان ہی مبتلا ہے ٹامس ہابس کہتا ہے "تمام انسانوں میں سے صرف وہی افراد اس میں

سب سے زیادہ مبتلا ہیں جن کا مشغلہ فلسفہ ہے۔ کیونکہ سسرو نے ان کے متعلق کسی جگہ جو کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے: کوئی بیہودہ ولایعنی شے ایسی نہیں جو فلسفیوں کی کتابوں میں نہ ملتی ہو[۱]" اور ڈیکارٹ، فلسفہ جدید کا آدم کہتا ہے کہ "کالج کی زندگی ہی میں مجھے اس شے کا علم تھا کہ کوئی عجیب سی عجیب اور انوکھی سی انوکھی بات ایسی نہیں تصور کی جاسکتی! جس کا کوئی نہ کوئی فلسفی قائل نہ ملتا ہو[۲]"

مخصوص ماہرِ فن (Specialist) کی تعریف بعض دفعہ ظرافت آمیز طریقہ پر اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وہ حضرت ہیں 'جو کم سے کم شے کا زیادہ سے زیادہ علم رکھتے ہیں'۔ اسی تعریف کو اُلٹ کر فلسفی کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ وہ ذی علم بزرگ ہیں جو زیادہ سے زیادہ شے کا کم سے کم علم رکھتے ہیں! فلسفی کی مثال اس اندھے سے بھی دی گئی جو ایک تاریک کمرہ میں ایک کالی بلی کی تلاش کر رہا ہے جو وہاں موجود نہیں۔ اور حضرت اکبر الہ آبادی نے تو زیادہ متانت کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں!

امریکہ کی ایک مشہور یونیورسٹی کے ایک ممتاز پریسیڈنٹ اپنے طلبہ کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ وہ تین چیزوں سے پرہیز کریں: شراب نوشی، تمباکو اور فلسفہ!

خود فلسفیوں نے فلسفہ پر شدت کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے۔ ہم نے اوپر ایجابیہ وارتیابیہ کے اعتراضات بیان کیے ہیں۔ یہاں پر چند اور نکتہ چینیوں کا ذکر کیا جاتا ہے نیٹشے کہتا ہے کہ "رفتہ رفتہ مجھ پر یہ بات روشن ہوئی ہے کہ ہر عظیم الشان فلسفہ اب تک صرف دو چیزوں پر مشتمل ہوتا آیا ہے: بانی کا اعتراف و اقرار، اور ایک قسم کی اپنی غیر ارادی و غیر شعوری سوانح حیات"۔ پروفیسر جان ڈیوے

۱؎ ہابس کی کتاب Leviathan ۲؎ دیکھو ڈیکارٹ کی کتاب Discourse on Methods یہ دونوں حوالے رانیڈ کی ماڈرن کلاسکل فلاسفرز میں ص۲ و ص۱۱۱ پر ملینگے۔

اور پروفیسر جے۔ ایچ۔ راجسن کا خیال ہے کہ فلاطون سے لے کر اسپنسر تک کا فلسفہ سوائے پہلے ہی سے موجودہ اخلاقی و مذہبی و سیاسی تیقنات کو عقلی صورت بخشنے کی کوشش کے اور کچھ نہیں! بہت سارے مفکرین اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عہد سلف کے اکثر فلسفے کا محرک مذہبی ایمان و ایقان رہا ہے۔ عضویت کی اشتہاآت و خواہشات معاشری و تعلیمی اثرات ہی کے پیدا کردہ تیقنات کسی فلسفہ کے تعیین و تشکیل میں اہم اجزائے عاملہ کا کام دیتے رہے ہیں۔ براڈلے نے ان ہی خیالات کی بنا پر فلسفہ کو ہمارے جبلی تیقنات کے متعلق خراب حجتوں کا دریافت کرنا قرار دیا تھا، لیکن وہ اس امر کا بھی اضافہ کرتا تھا کہ ان حجتوں کا دریافت کرنا بھی خود ایک جبلی عمل ہے!

اس امر میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ فلسفہ کی جڑیں فطرت انسانی میں جمی ہوئی ہوتی ہیں، اور انسان کی زندگی پر جو معاشری اثرات ہوتے ہیں وہی فلسفہ کی تشکیل و تعیین کرتے ہیں۔ اسی لیے فشٹے نے تو کہا تھا کہ "جیسا آدمی ویسا فلسفہ!" لیکن یہ بھی حدِ امکان سے کوئی خارج شئے نہیں کہ سچا فلسفی صداقت کی تلاش ہی کو اپنی غایت قرار دے لے، وہ صداقت جو "برہنہ صداقت کہلاتی ہو، جو نہ کوئی دوست رکھتی ہو اور نہ کسی انعام کی خواہش اور نہ زجر و توبیخ کا غم!" اس قسم کی احتیاط سے، یعنی صداقت ہی کی تلاش کو اپنی غایت قصوی قرار دے لینے سے فلسفی اپنے تیقنات کی جانب داری اور اپنے تنفرات کی دشمنی سے اپنے کو محفوظ رکھ سکتا ہے اور اپنے فلسفہ کو ان سے متاثر ہونے سے بچا سکتا ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ممکن ہے کہ انسان انسان ہونے کی حیثیت سے تجسس و استعجاب کی نہ بجھنے والی آگ اپنی فطرت میں روشن پاتا ہے، اور جب تک یہ دنیا انسان کے ذہن کو مہیب و پُراسرار نظر آتی رہیگی اس وقت تک فلسفہ آب و تاب کے ساتھ سخن راں و سخن آرا رہیگا۔ انسان فطرۃً عاقل ہونے کی وجہ سے اس وقت تک آرام و چین کی نیند نہیں سو سکتا جب تک کہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے پردہ

نہ اُٹھ جائے! رابرٹ لوائی اسٹیونس نے اسی خیال کو ظریفانہ انداز میں اس طرح ادا کیا ہے: "بعض لوگ کائنات کو اسی طرح نگل جاتے ہیں جس طرح کسی دوائی کی گولی کو..... زندگی کے تنازعات و تخالفات سے بالکلیہ بے حس و بے خبر ہوتے اور ہر چیز کو ایک ایسی سادہ لوحی کے ساتھ قبول کر لینے سے جس پر بے کسی و بے بسی برستی ہو، یہ بہتر ہے کہ ان کے متعلق ہماری زبان سے نظریہ کی شکل میں ایک چیخ نکل جائے" اور یہی چیخ ہمارا فلسفہ ہوتا ہے!

(۵) متناقض فلسفیانہ نظریات ذہنی اضطراب پیدا کرتے ہیں:۔

فلسفہ کے مبتدی کو فلسفہ کی سب سے زیادہ اہم مشکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکابر فلاسفہ کا اساسی مسائل کے متعلق اتفاق نہیں۔ ان کے طریقے اور ان کے نتائج ایک دوسرے سے اس قدر مختلف نظر آتے ہیں کہ طالب علم کو شبہ ہوتا ہے کہ آخر ان کے تضاد و تخالف کے بعد کوئی قابل قبول شئے باقی بھی رہ جاتی ہے، یا پردہ غیب سے یہ آواز سننی پڑتی ہے کہ ع اے بے خبراں راہ نہ آنست و نہ ایں!؟

اس امر کا خیال رکھتے ہوئے کہ فلاسفہ کے باہمی اختلاف کی کچھ تو وجہ اپنے اپنے زمانہ کے مختلف اصطلاحات و حدود کا استعمال ہے طالب علم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا بقول جوشیا راس "تجربہ کا ایک لامتناہی خزانہ ہے" اور جو لوگ اپنی فطرت، ساخت، تعلیم و تربیت میں مختلف ہیں ان کا اسی ایک دنیا پر ردعمل بھی مختلف ہوگا۔ بالفاظ دیگر فلسفی کی انفرادیت کے اختلاف کی وجہ سے نظریات کائنات میں اختلاف کا پیدا ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ نظریات (جن کا مجموعہ فلسفہ ہے) پیداوار ہیں دنیا اور ان مختلف ذہنوں کے باہمی عمل کا جو اس متنوع و نامحدود دنیا کے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں جب ہم کسی فلسفی کی آراء کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان طبیعی، حیاتیاتی و معاشرتی اجزاء کا بھی ذکر ضرور خیال رکھنا چاہیے جو اس کے تیقنات و اذعانات کی تشکیل و تعیین میں

ضروری حصّہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ طریقہ کار چند اکابر فلاسفہ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو تخالفِ آراء کی وجہ سے فلسفہ سے گریز کرنے کا میلان اگر غائب نہ ہو جائے تو کم ضرور ہو جائیگا۔ علاوہ ازیں یہ بات ہرگز فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جہاں کہیں انسان نے تجربہ کے واقعات پر غور و فکر کر کے ان کے تعمیم کی کوشش کی ہے، خواہ وہ سائنس میں ہو یا روزمرہ کی زندگی میں، وہاں رائے اور یقین کا اختلاف ضرور پیدا ہوا ہے۔ قائدینِ فکر کے تیقنات کا یہ اختلاف و تباین جو زندگی کے اہم مسائل کے متعلق پیدا ہوتا ہے دراصل ایک نعمت ہے، کیونکہ اسی تنقید و اختلاف سے فلسفیانہ روح بیدار ہوتی ہے اور زندگی اور کائنات کے متعلق عمیق تر حقائق و بصائر حاصل کرتی ہے! ہیوم کی تباہ کن تنقید نے کانٹ کو خوابِ ادعایت سے بیدار کیا جس کی وجہ سے فلسفہ کا ایک عظیم الشان نظام پیدا ہو سکا۔ کوئی سنجیدہ آدمی محض اس وجہ سے کہ اکابرِ فلاسفہ کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے فلسفہ سے بیزار اور روگرداں نہیں ہو سکتا، ورنہ اس کی مثال اس بیمار کی سی ہوگی (جس کا ذکر ہیگل کرتا ہے) جس کو ڈاکٹر نے میوہ کھانے کی ہدایت کی تھی، اس نے سیب، ناشپاتی، انگور کھانے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کو تو "میوہ" کھانے کے لیے کہا گیا تھا اور یہ سیب ناشپاتی وغیرہ تو محض سیب ناشپاتی ہی ہیں (یعنی جزی) اور میوہ نہیں (یعنی کلی)

(۶) شک کا خطرہ فلسفی کو لگا رہتا ہے۔

فلسفہ صداقت کی پیہم مسلسل، غیر جانبدارانہ تلاش ہے، ممکن ہے کہ اس تلاش میں وہ تصورات و تیقنات جو محض روایتوں اور دیگر ناکافی شہادتوں پر مبنی ہوں ٹھکرا دیے جائیں۔ کیونکہ صداقت کی مثال ایک متکبر شہزادی کی سی ہے جو اپنے ہوا خواہوں سے کامل انقیاد و فرمانبرداری چاہتی ہے۔ شوپنہور اس "اچھے، مرفہ الحال یونیورسٹی کے فلسفہ" کا مضحکہ اُڑاتا ہے، جس کے ہزاروں مقاصد اور لاکھوں محرکات ہوتے ہیں۔

جو نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتا ہے، جس کی نظروں کے آگے ہمیشہ خدا کا خوف، وزارت کی مرضی، کلیسا کے قوانین، ناشرین کتب کی خواہشات، طلبہ کی حاضری، رفقا کی حسنِ ارادت، سیاسیات حاضرہ کا رجحان اور خدا جانے کن کن چیزوں کا خیال ہوتا ہے!" اس کے برخلاف صحیح فلسفہ کی تعریف میں وہ کہتا ہے کہ "یہ اس برہنہ صداقت کا جویا ہے جو نہ کوئی مونس و غم خوار رکھتی ہے، جس کو نہ کسی انعام کی خواہش ہے اور نہ زجر و توبیخ کا اندیشہ" ظاہر ہے کہ ایسا فلسفہ ان عقائد و اذعانات کو تباہ و برباد کردیگا جن کی بنیاد توہمات و غیر صحیح روایات پر قائم ہے۔ اگر ہمارے اخلاقی اور مذہبی عقائد تنگ اور کوتاہ ہوں تو فلسفہ کا مطالعہ ان میں ضرور اختلال و اضطراب پیدا کریگا۔ اگر آپ فلسفہ سے یہ توقع رکھیں کہ وہ آپ کے ان جبلی و مذہبی عقائد و تیقنات کو حق بجانب ثابت کر دکھائے اور صداقت کی پیروی نہ کرے تو پھر آپ بقول برٹرنڈرسل کے اپنے محافظ سے بھی اس امر کی اُمید کرسکتے ہیں کہ بجٹ میں باوجود خسارہ ہونے کے آپ کو اضافہ ہی کی خوشخبری دیتا رہے! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنے کمزور اور متزلزل تیقنات و عقائد کو جن کی بنا غلط روایات اور جاہلانہ رواج پر قائم ہے محکِ تنقید پر جانچیں (گو یہ عمل ہمارے لیے نہایت ہی دردناک اور تکلیف دہ کیوں نہ ثابت ہو) اور دیکھیں کہ یہ غلط اور نقصان رساں تو نہیں؟ جن تیقنات کے متعلق ہمیں یہ خوف ہو کہ سائنس کے بڑھتے ہوئے معلومات ان کو تباہ کردینگے ان سے ہمیں کس قسم کی تسلی یا تشفی نصیب ہوسکتی ہے؟ اور ممکن ہے کہ تحقیق و تدقیق کے بعد ان کے متعلق یہ بات ثابت ہوجائے کہ یہ انسان کی بالکل ابتدائی تہذیب کے باقیات ہیں اور محض توہمات! علاوہ ازیں ممکن ہے کہ یہ محض غلط ہوں اور عمل میں نقصان رساں!

سینٹ پال کے اس قول میں ہم صحیح فلسفیانہ بصیرت پاتے ہیں: "تمام چیزوں کو جانچو، صرف اسی چیز کو مضبوط پکڑو جو اچھی ہو"

یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ "عہد ایمان" ضروری طور پر اخلاق حسنہ کا عہد رہا ہے۔ اور "عہد ارتیاب" فسق وفجور اور ردارۃ اخلاق کا زمانہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ ایمان کس قسم کا ہے اور ارتیاب کس قسم کا؟ محض تحکمانہ ایمان اور مذہبی جذبہ سے اخلاقی اذعانات اور اخلاقی جوش عمل کو جانچا نہیں جا سکتا۔ 'زہد عیاں' و 'فسق پنہاں' کی بیشمار مثالیں بھلائی نہیں جا سکتیں، محض 'روبکار' ہونے اور 'جامہ پاک' پہننے اور 'پناہ ریش' لینے سے انسان پاک باز و نیک کردار نہیں بن سکتا۔ خیام نے اس حقیقت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

شیخے بہ زنے فاحشہ گفتا مستی! ہر لحظہ بہ دام دگرے پابستی!

گفتا شیخا! ہر انچہ گوئی ہستم! اما تو چناں کہ می نمائی ہستی!

مذہب پر یقین رکھ کر، تسبیح ہزار دانہ ہاتھ میں لے کر اور جامۂ صوف پہن کر بھی آدمی معاملاتِ زندگی میں شیطان کو شرما سکتا ہے! اس کے برخلاف محض ریب و شک ہی کی بنا پر انسان دائرہ اخلاق سے خارج نہیں ہو جاتا۔ بچوں کا میلان یقین کی طرف ہوا کرتا ہے لیکن صرف سنجیدہ اور ذی علم شخص ہی شک کر سکتا ہے مفکر کے لیے شک علمی ترقی کا ایک ضروری زینہ ہے۔ جس نے شک کرنا نہیں سیکھا اس نے غور و فکر کرنا ہی نہیں سیکھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر شک فکر نہیں۔ ایک کاہل شخص کسی مسئلہ کو حل کرنے کی جانکاہ کوشش سے بچنے کے لیے شک کے دامن میں پناہ لے سکتا ہے، یا یہ ایک ایسے ذہن کا غیر شعوری استدلال ہو سکتا ہے جس پر تعصب کی عینک چڑھی ہوئی ہے۔ فلسفیانہ طور پر وہی شک جائز رکھا جا سکتا ہے جو بے غرض ہو اور باقاعدہ و منظم ہو۔ اس نقطۂ نظر سے شک کوئی غایت نہیں بلکہ ایک ذریعہ ہے، فکر کی ترقی و تقدم کا ایک لازمی و لابدی درمیانی زینہ جو صداقت کے ادنیٰ، کم تر و تنگ تر مقام سے اعلیٰ بہتر و وسیع و کشادہ مقام تک پہنچنا چاہتا ہے۔ پروفیسر

ڈبلیو۔ کے۔ کلفرڈ نے کہا تھا کہ "کسی چیز کو ناکافی شہادت کی بنا پر مان لینا ہر شخص کے لیے ہر وقت اور ہر جگہ غلط ہے۔" کلفرڈ کے اس صداقت بھرے جملے کو ہر فلسفیانہ مزاج شخص بلا تامل ماننے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ تاہم اس میں صرف اس قدر اضافہ کرنا ضروری ہے (ولیم جیمس نے اس کو اپنے مشہور و معروف مضمون "ارادۂ ایمان" میں اچھی طرح پیش کیا ہے) کہ اگر کسی رائے کی موافقت میں شہادت معقول اور ظنّی ہو، لیکن کامل نہ کہلائی جاسکتی ہو گو اس سے زیادہ قابل حصول بھی نہ ہو، اور اگر کوئی شخص یہ جانتا ہو کہ اس ظنی صداقت کے قبول کرنے سے وہ ایک بہتر و برتر فرد بن سکتا ہے اور دوسروں کی بھی زیادہ خدمت کرسکتا ہے تو پھر کیا اس کا یہ فریضہ نہ ہوگا کہ اس پر یقین کرلے؟

فلسفہ کا مطالعہ دودھاری تلوار ہے جس سے انسان کو فائدے بھی پہنچ سکتے ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن یہ حال ہر علم کا ہے فلسفہ ہی کی تخصیص نہیں[1] مثلاً سیاسیات، طب، ادب وغیرہ کے مطالعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی معاشرہ کے نقصان و ضرر کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح فلسفہ کی تعلیم کی وجہ سے انسان صحیح چیز کو غلط، نیک کو بد بنا سکتا ہے اور صداقت کو محض اضافی چیز قرار دے سکتا ہے۔ سوفسطائیوں نے یہی کیا اور خیر و حسن و صداقت کو محض اضافی اقدار قرار دیا۔ فلسفہ کا مطالعہ انسان کو بڑا نا شکی، کٹر ایجابی اور خود پرست کلبی بنا سکتا ہے جو اپنے غرور و تکبر، خود غرضی و

---

[1] اندلس کے ایک کہنہ سال پختہ کار فلسفی کی زبانی سنو "نفع و ضرر کی متضاد استعداد سے دنیا کی کون چیز مستثنیٰ ہے؟ غذا کا تداخل اور اس کی کثرت معدہ میں بار پیدا کرتی ہے۔ بس کیا اس بنا پر تم یہ طبی قاعدہ مقرر کرسکتے ہو کہ تغذیہ طبّاً مضر ہے؟ اصل یہ ہے کہ بیدینی فلسفہ کی تعلیم کا لازمی نتیجہ نہیں، کیا صرف فلاسفہ بیدین ہوتے ہیں، فقہاء کبھی گمراہ نہیں ہوتے حالانکہ تجربہ بتاتا ہے کہ فلسفہ سے زیادہ فقہ سے بیدینی کی اشاعت ہوتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ فقہ کی بیدینی پر جبہ و عمامہ پردہ ڈالے رہتے ہیں، اس کی بداخلاقیاں ہمیشہ مذہبی رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس لیے عام لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی"

(ابن رشد مصنفہ مولوی محمد یونس ص۱۶۵ و ص۱۶۶)

ایغویت کی بنا پر خود کو بینا اور دوسروں کو کور، خود کو سردار دوسروں کو غلام قرار دیتے ہیں۔ دیو جانس کلبی کا قصّہ مشہور ہے کہ وہ ایک روز اثینیا میں پکارنے لگا کہ "لوگو میری طرف آؤ" جب چند لوگ اس کی طرف بڑھے تو اُس نے انہیں اپنے سونٹے سے مار بھگایا اور کہا کہ "میں نے تو آدمیوں کو بلایا تھا تم تو بول و براز ہو"! فلسفہ کی تعلیم سے اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہونا ممکنات سے ہے۔ اس کے برخلاف اس امر کا بھی زیادہ احتمال ہے کہ جو شخص فلسفہ کا مطالعہ سچائی و ثابت قدمی کے ساتھ کرتا ہے تو اس میں ایک قسم کی تنقیدی قابلیت پیدا ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے وہ خیر و شر، نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اور مخالفین کی آرا کے ساتھ تحمل و مسامحت سے پیش آسکتا ہے۔ چونکہ فلسفی میں جاننے اور سمجھنے کی نہایت شدید خواہش پائی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ منطقی سرعتِ ذہنی و احتیاط بھی موجود ہوتی ہے لہذا وہ جن چیزوں کو قبول کرتا ہے ان کو بھی وہ مشروطی و موقتی قرار دیتا ہے اور ان کو نئے علم کی روشنی میں قابلِ تغیر سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن ہمیشہ نئے نظریات کو قبول کرنے اور قدیم نظریات میں تغیر پیدا کرنے کے لیے کھُلا رہتا ہے۔ فلسفی کی دُعا یہ ہوتی ہے کہ "خدایا مجھے ایک کشادہ اور کھلا ذہن عطا فرما، بند ذہن نہیں جو نئے علم کی روشنی کی شعاع کو داخل ہونے نہ دے" اور یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ فلسفی کے اخلاقی اور ذہنی تیقنات نہیں ہوتے۔ وہ فراخ دلی و حزم و احتیاط کے ساتھ خاص خاص اخلاقی و ذہنی نتائج تک پہنچتا ہے اور ان پر یقین کرتا ہے۔

فلسفہ کی ان مختلف مشکلات کا خیال رکھتے ہوئے، جن کا نہایت اجمال کے ساتھ ہم نے اوپر ذکر کیا ہم عاشق کی زبان میں عشق کی بجائے فلسفہ کو مخاطب

کر کے کہہ سکتے ہیں :-

اے عشق! بہ دردِ تو سرے می باید　　صیدِ تو زمن قوی ترے می باید

منِ مُرغ بیک شعلہ کباہم بگذار　　کایں آتش را سمندرے می باید

(ابوسعید مہنہ)